مقالات

عبادت اور عبودیت

(۴)

از افادات امام ابن تیمیہ رحمہ اللہ

(ترجمہ مولوی صدر الدین صاحب اصلاحی)

اس توضیح کے بعد یہ بات بآسانی سمجھ میں آجاتی ہے کہ قلب انسانی کے اندر اللہ تعالیٰ کی محبت جتنی زیادہ ہوتی جائے گی اتنی ہی اس کی عبودیت بھی بڑھتی جائے گی اور وہ ماسوا سے اسی قدر آزاد اور بے نیاز ہوتا چلا جائے گا۔ علیٰ ہذا القیاس جس قدر اس میں عبدیت کا رنگ گہرا ہوتا جائے گا اتنا ہی اللہ کے عشق اور غیر اللہ سے بے نیازی کا نقش پائیدار ہوتا جائے گا۔

قلب انسانی کی خصوصیت انسان فطرۃً اللہ تعالیٰ کی احتیاج محسوس کرتا ہے۔ ایسی احتیاج جس میں عجز اور تذلل کا عنصر بھی شامل ہے۔ اس احتیاج کی دو جہتیں ہیں۔ ایک تو جہت عبادت جس کو علت غائی کہنا چاہیے۔ دوسری جہت استعانت و توکل جس کو علت فاعلی کہنا چاہیے۔ پس قلب انسانی اللہ کی عبادت، محبت اور اس کی طرف انابت کے بغیر نہ تو کبھی حقیقی صلاح و فلاح حاصل کر سکتا ہے، اور نہ ہی سچی لذت اور سرور کی دولت سے بہرہ ور ہو سکتا ہے اور نہ سکون خالص اور اطمینان صادق کی نعمت سے لطف اندوز ہو سکتا ہے۔ اس کو دنیا کی ساری نعمتیں اور لذتیں میسر کیوں نہ آجائیں لیکن پھر بھی اضطراب کی خلش اس کی گہرائیوں میں موجود ہی رہے گی اور حقیقی سکون و اطمینان کی لذت سے محروم ہی رہے گا، کیونکہ اس کے اندر محبوب حقیقی کی ایک فطری پیاس موجود ہے اور وہ اپنے اندر اپنے پروردگار کی ایک ذاتی احتیاج اور فطری طلب رکھتا ہے۔ اس لیے کہ فی الواقع وہی اس کا اصلی معبود اور محبوب ہے اور اسی کو پاکر وہ صحیح معنوں میں سکون و طمانیت اور لذت و سرور کی شادکامیوں سے متمتع ہو سکتا ہے۔ اور یہ چیز اس کو حاصل ہو نہیں سکتی جب تک اللہ تعالیٰ ہی اس کی دستگیری نہ کرے۔ اس کے ماسوا اس پوری کائنات میں کوئی نہیں جو اس کے کام آسکے۔ پس انسان کا قلب دائمی طور پر اِيَّاكَ نَعْبُدُ وَاِيَّاكَ نَسْتَعِيْنُ کی روح اور اس کی حقیقت کا فطرۃً محتاج ہے۔ اس لیے اگر اس کے اس محبوب اور مقصود حقیقی کے حصول میں اس کی اعانت کر بھی دی جائے لیکن عبادت الٰہی کا ایسا سچا ذوق اس میں موجود نہ ہو کہ وہی اس کی طلب و جستجو کا مرکز و منتہا قرار پا چکا ہو، اول و آخر اسی کی محبت اس کا سرمایہ زندگی بن چکی ہو اور اس کے علاوہ جس کسی سے بھی وہ محبت کرتا ہو، اصالۃً نہ کرتا ہو بلکہ خدا ہی کے لیے کرتا ہو، تو اس کیفیت کے ہوتے ہوئے بھی وہ نہ تو لا الٰہ الا اللہ کا رمز شناس ہو سکتا نہ توحید، عبدیت اور محبت الٰہی کے ذروۂ کمال تک اس کی رسائی ہو سکتی ہے۔ اس حالت میں نہ صرف اس میں ایک نقص اور عیب موجود ہوگا بلکہ ہمہ وقت وہ ایک قسم کی بے چینی اور حسرت اور اندرونی گھٹن محسوس کرتا رہے گا۔

اسی طرح اگر وہ خدا کو اپنا مطلوب حقیقی تو سمجھتا ہو اور اس کے حاصل کرنے کے لیے ریاضتیں بھی کرتا ہو مگر اس سعی و جستجو میں توفیق طلبی کرتا ہو نہ اس مقصد کے حصول میں اس کی اعانتوں کا خود کو حاجتمند سمجھتا ہو اور نہ اس سلسلہ میں تنہا وہی اس کی امیدوں کا ملجا و ماویٰ ہو

تو کبھی بھی گوہرِ مقصود سے اس کا دامن بھر نہیں سکتا، کیونکہ کسی چیز کا وجود و عدم خدا ہی کی مشیت کے تابع ہے۔

پس انسان دو حیثیتوں سے اللہ جل شانہٗ کا محتاج ٹھیرا۔ ایک تو یہ کہ وہی اس کا تنہا الٰہ، حقیقی مطلوب اور محبوب و معبود ہے۔ دوسری یہ کہ تنہا وہی اس کا چارہ ساز، پشت پناہ، دست گیر، مرکزِ امان اور مرجعِ اعتماد ہے۔ یعنی وہی اس کا "الٰہ" ہے جس کے سوا کوئی اس کا معبود نہیں، اور پھر وہی اس کا "رب" ہے جس کے سوا کوئی اس کا مالک و آقا نہیں۔ اور عبودیتِ انسان کی کامل نہیں ہو سکتی جب تک کہ یہ دونوں چیزیں موجود نہ ہوں۔ ورنہ اگر کوئی شخص کسی بھی غیر اللہ کی محبت بالذات کرتا ہے یا اس سے اعانت کی امیدیں وابستہ رکھتا ہے تو در اصل وہ اس محبت و امید کی مقدار کے مطابق اسی کا بندہ ہے۔ بخلاف اس کے اگر غیر اللہ سے اس کی محبت بالذات نہ ہو بلکہ خدا ہی کے لیے ہو، نیز خدا کے سوا کبھی کسی سے کوئی امید نہ باندھتا ہو اور جن اسباب و ذرائع سے اپنے مقاصد کے حصول میں کام لیتا ہو یا مقاصد کو حاصل کرتا ہو ان کے متعلق پورے شرحِ صدر کے ساتھ یقین رکھتا ہو کہ اللہ تعالیٰ ہی ہے جس نے ان اسباب کو پیدا اور مقدر کیا ہے، بجائے خود یہ کوئی قدرت اور تاثیر نہیں رکھتے، نہ کسی اور کے اشارہ پر یہ معرضِ وجود میں آتے ہیں، بلکہ اس زمین کی سطح سے لے کر آسمان کی بلندیوں تک جتنی مخلوقات ہیں سب کا پروردگار، مالک، آقا اور سب کا خالق اللہ ہی ہے اور سب اسی کی بہمہ وجوہ محتاج ہیں ——— اگر انسان ان صفات سے آراستہ ہے تو سمجھنا چاہیے کہ وہ اپنی قسمت کے مطابق کمالِ عبودیت سے سرفراز ہے۔ اور اس سعادت کے حصول میں لوگوں کے درجے اس قدر مختلف ہیں کہ ان کا صحیح اندازہ اور شمار اللہ ہی کو معلوم ہے اور تمام مخلوق میں فضل و کمال، عظمت و مکرمت اور ہدایت و تقربِ الٰہی کے لحاظ سے وہی شخص اعلیٰ و افضل ہے جس کی عبدیت مذکورہ بالا وجوہ سے اعلیٰ و اکمل ہو۔

اسلام کی حقیقت یہی ہے اس دین کی حقیقت جسے اسلام کہا جاتا ہے اور جس کی تعلیم و تبلیغ کے لیے اللہ تعالیٰ نے اپنے انبیاء کو مبعوث فرمایا اور اپنی کتابیں نازل کیں۔ یعنی یہ کہ بندہ اپنے آپ کو ہر حیثیت سے خدا ہی کا تابع فرمان بنا دے اور ذرہ برابر بھی کسی غیر کا فرماں بردار نہ رہے۔ ایسا شخص جو خدا کو بھی اطاعت کا مستحق سمجھتا ہے اور ساتھ ہی کسی دوسرے کو بھی، وہ مشرک ہے۔ اسی طرح اس کے برعکس جو خدائی اطاعت و انقیاد کو سرے سے تسلیم ہی نہیں کرتا وہ متکبر ہے۔

کبر اور عبدیت میں منافات اور کبر کے بارے میں آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے:

"یقیناً جنت میں وہ شخص داخل نہیں ہو سکتا جس کے دل میں ذرہ بھر بھی غرور ہوگا۔ بالکل اسی طرح جس طرح دوزخ میں وہ شخص نہیں جا سکتا جس کے اندر ذرہ برابر بھی ایمان ہوگا۔" (صحیح بخاری)

گویا معلوم ہوا ایمان کے نزدیک غرور اور ایمان ایک دوسرے کی ضد ہیں، کیونکہ غرور عبودیت کی حقیقت کے بالکل منافی ہے جیسا کہ حدیث قدسی کے الفاظ بتلاتے ہیں:

"اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ عظمت میری ازار ہے اور کبریائی میری ردا ہے۔ پس جو شخص ان دونوں میں سے کوئی چیز بھی مجھ سے چھیننے کی کوشش کرے گا میں اس کو سخت سزا دوں گا۔" (صحیح بخاری)

معلوم ہوا کہ عظمت اور کبریائی ربوبیت کے خصائص میں سے ہیں۔ کسی مخلوق کو ان صفاتِ جلالی میں سے کوئی حصہ بھی نہیں ملا ہے۔ لیکن ان دونوں میں بھی کبریائی کا مقام عظمت سے اونچا ہے۔ اسی لیے اللہ تعالیٰ نے اسے بمنزلہ ردا قرار دیا ہے اور عظمت کو بمنزلہ ازار سمجھا ہے۔ ردا ازار سے بلند مقام پر ہوتی ہے۔ یہی راز ہے کہ اذان، نماز اور عیدین کا شعار "اللہ اکبر" ٹھیرایا گیا ہے اور یہ کلمہ مسلمان کے لیے سنت قرار دیا گیا ہے۔

کہ جب وہ بلند مقامات پر مثلاً صفا اور مروہ پر ہو یا کسی اونچائی پر چڑھ رہا ہو یا کسی جانور پر سوار ہو، یا ہو تو تکبیر کہے اور اللہ جل شانہ کی کبریائی کا اعلان کرے۔ اس تکبیر کا یہ اعجاز ہے کہ اس ۔۔ بھڑکتی ہوئی آگ کے بلند سے بلند شعلے سرد پڑ جاتے ہیں اور شیطان اس کو سننے کی تاب نہیں لا سکتا۔ اللہ تعالیٰ کا فیصلہ ہے کہ:

ادْعُونِي أَسْتَجِبْ لَكُمْ إِنَّ الَّذِينَ يَسْتَكْبِرُونَ عَنْ عِبَادَتِي سَيَدْخُلُونَ جَهَنَّمَ دَاخِرِينَ۔

مجھے پکارو میں تمھاری التجائیں سنوں گا۔ یقیناً جو لوگ میری بندگی سے منہ موڑتے ہیں وہ جلد ذلت کے عالم میں داخل جہنم ہوں گے۔

کبر مستلزم شرک ہے ہر وہ شخص جو خدا کی بندگی سے استکبار کرتا ہے، ضروری ہے کہ وہ کسی نہ کسی غیر اللہ کی بندگی کا قلادہ اپنی گردن میں ڈالے ہوئے ہو گا کیونکہ انسان کوئی بے حس اور جامد شے نہیں ہے بلکہ وہ فطرتاً ایک حساس اور متحرک ہستی ہے۔ صحیح حدیث میں ہے کہ حارث اور ہمام "سب سے زیادہ سچے اور ثابت الوجود اسما یعنی صفات انسانی ہیں۔ "حارث" کے معنی ہیں کمانے والا اور حرکت و عمل کرنے والا۔ اور "ہمام" کے معنی ہیں ارادہ کرنے والا۔ پس ارادہ انسان کی ایک ذاتی صفت ہے جس سے وہ کبھی خالی نہیں ہو سکتا۔ پھر ہر ارادہ کا ایک مقصود اور منتہیٰ پایا جانا بھی ضروری ہے۔ ان دونوں مقدموں کو تسلیم کرنے کے بعد اس امر واقعی سے انکار کی گنجائش نہیں رہ جاتی کہ ہر انسان کا ایک محبوب مقصود ہونا چاہیے جو اس کی محبتوں کا محور اور ارادوں کا مرکز ہو۔ پس جس شخص کا معبود و محبوب اللہ تعالیٰ نہ ہو وہ خدا کی محبت اور نیازمندی سے اپنے کو برتر اور بے نیاز سمجھتا ہو، لازماً کوئی نہ کوئی غیر اللہ اس کا مراد اور محبوب ضرور ہو گا جو اس کو اپنا غلام اور بندہ بنائے ہوئے ہو گا، خواہ وہ مال و زر ہو یا شان و شوکت ہو یا حسن و جمال ہو، یا خدا کے سوا اس کا خود ساختہ کوئی معبود ہو، مثلاً چاند، سورج، ستارے، مورتیاں، انبیا و صلحا کی قبریں وغیرہ یا کوئی نبی یا فرشتہ یا کوئی اور شے جس کا وہ خدا کو چھوڑ کر پجاری ہو۔ اور جب وہ کسی غیر اللہ کا پرستار بن گیا تو پھر اس کے مشرک ہونے میں کون سی کسر رہ گئی۔ معلوم ہوا کہ جو مستکبر ہو گا مشرک ضرور ہو گا۔

فرعون کی مثال چنانچہ فرعون کی مثال اس حقیقت کی ایک زندہ شہادت ہے، جو دنیا کا عظیم ترین مستکبر گزرا ہے لیکن ساتھ ہی مشرک بھی تھا۔ پہلی چیز یعنی اس کے استکبار کا ذکر متعدد آیات میں بالتفصیل موجود ہے:

وَقَالَ فِرْعَوْنُ ذَرُونِي أَقْتُلْ مُوسَىٰ وَلْيَدْعُ رَبَّهُ ...... وَقَالَ مُوسَىٰ إِنِّي عُذْتُ بِرَبِّي وَرَبِّكُمْ مِنْ كُلِّ مُتَكَبِّرٍ لَا يُؤْمِنُ بِيَوْمِ الْحِسَابِ ..... كَذَٰلِكَ يَطْبَعُ اللَّهُ عَلَىٰ كُلِّ قَلْبِ مُتَكَبِّرٍ جَبَّارٍ ...

اور فرعون نے کہا مجھے موسیٰ کو قتل کرنے دو اور پکارے وہ اپنے رب کو بلائے ۔۔۔ اور موسیٰ نے کہا کہ میں نے اس متکبر سے، جو حساب کے دن پر ایمان نہیں رکھتا، اپنے اور تمھارے رب کی پناہ مانگتا ہوں ۔۔۔۔ اسی طرح اللہ تعالیٰ ہر سخت گیر متکبر کے دل پر مہر کر دیا کرتا ہے۔

وَقَارُونَ وَفِرْعَوْنَ وَهَامَانَ وَلَقَدْ جَاءَهُمْ مُوسَىٰ بِالْبَيِّنَاتِ فَاسْتَكْبَرُوا فِي الْأَرْضِ وَمَا كَانُوا سَابِقِينَ۔

اور قارون اور فرعون اور ہامان، جن کے پاس موسیٰ روشن دلائل لیکر آئے لیکن انھوں نے خدا کے ماننے اور اس کی بندگی سے انکار کر دیا اور دنیا میں کبر و غرور کی روش اختیار کی، حالانکہ وہ ہم سے بچ نکلنے والے نہ تھے۔

فَلَمَّا جَاءَتْهُمْ آيَاتُنَا مُبْصِرَةً قَالُوا هَٰذَا سِحْرٌ مُبِينٌ وَجَحَدُوا بِهَا وَاسْتَيْقَنَتْهَا أَنْفُسُهُمْ ظُلْمًا وَعُلُوًّا فَانْظُرْ كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الْمُفْسِدِينَ۔

جب ان کے پاس ہماری نشانیاں بالکل کھلے طور پر آئیں تو انھوں نے کہا یہ تو صریح جادو ہے اور ان کو ماننے سے انھوں نے ظلم اور سرکشی کی بنا پر انکار کر دیا، حالانکہ ان کے دل ان کی صداقت کا یقین رکھتے تھے سو

دیکھو کہ ان فسادیوں کا انجام کیسا ہوا؟۔

دوسری چیز پر یعنی یہ کہ فرعون مشرک تھا، یہ آیت گواہ ہے:۔

وَقَالَ الْمَلَأُ مِنْ قَوْمِ فِرْعَوْنَ أَتَذَرُ مُوسَىٰ وَقَوْمَهُ لِيُفْسِدُوا فِي الْأَرْضِ وَيَذَرَكَ وَآلِهَتَكَ۔

اور فرعون کی قوم میں سے بڑے لوگوں نے فرعون سے کہا کہ آپ موسیٰ اور اس کی قوم کو یوں ہی چھوڑے رہیں گے تاکہ وہ ملک میں فساد انگیزی کریں اور آپ کو اور آپ کے معبودوں کو چھوڑ دیں؟

اور نہ صرف یہ کہ ہر مستکبر مشرک ہوتا ہے بلکہ استقراء اور تجربہ بتلاتا ہے کہ جو شخص خدا کی بندگی اور اطاعت سے جتنا ہی زیادہ سرکشی کرتا ہے اتنا ہی زیادہ بڑا مشرک ہوتا ہے، کیونکہ عبادت الٰہی سے وہ جس قدر زیادہ سرتابی کرتا ہے گا اسی قدر اپنے کسی نہ کسی ایسے مراد و محبوب کا زیادہ محتاج اور نیاز کیش ہوتا جائے گا جو اس کے دل و دماغ کا مقصود اوّل اور مطلوب حقیقی ہوگا اور اس طرح وہ اپنے اس لات و منات کا اسی مناسبت سے بندہ بن جائے گا۔ کیونکہ یہ چیز انسان کی جبلت کے خلاف ہے کہ اس کا دل اپنا کوئی نہ کوئی مقصود و مطلوب نہ رکھتا ہو، اس لیے جب اصل مقصود یعنی اللہ تعالیٰ کو اس نے اپنے قلب سے نکال پھینکا تو ضرور ہے کہ کوئی دوسری شے اس خالی جگہ پر قبضہ کر لے، ورنہ تمام مخلوقات سے قلب انسانی کا خالی اور بے نیاز ہونا اس وقت تک ناممکن ہے جب تک کہ اللہ تعالیٰ ہی اس کا آقا و مولیٰ نہ بن جائے ـــــ ایسا آقا اور مولیٰ جس کے سوا وہ کسی کی عبادت نہ کرے، کسی سے مدد نہ مانگے، کسی پر توکل نہ کرے اور صرف اسی چیز سے خوش رہے جو خدا کو محبوب ہو اور اسی شے کو بری سمجھے جو خدا کے نزدیک مکروہ و مبغوض ہو، خدا کے دوستوں کو اپنا دوست سمجھے اور اس کے دشمنوں کو اپنا دشمن قرار دے، اسی کے لیے محبت کرے اور اسی کے لیے نفرت۔ اسی صفت باطنی کا نام اخلاص دین ہے، یہ اخلاص جتنا زیادہ عمیق اور استوار ہوگا خدا کی عبدیت اتنی ہی زیادہ کامل، اور ماسوا کی بے نیازی اسی قدر مکمل ہوگی، اور عبدیت کا حصول کمال ہی کبر اور شرک کا واحد علاج ہے۔

یہود و نصاریٰ کی اصلی گمراہیاں یہی دونوں بیماریاں ہیں جو اہل کتاب میں پیدا ہوگئی تھیں۔ نصاریٰ پر شرک غالب تھا اور یہودیوں پر کبر۔ جیسا کہ قرآن کریم کا ارشاد ہے۔ نصاریٰ کے متعلق فرمایا کہ:۔

اتَّخَذُوا أَحْبَارَهُمْ وَرُهْبَانَهُمْ أَرْبَابًا مِنْ دُونِ اللَّهِ وَالْمَسِيحَ ابْنَ مَرْيَمَ وَمَا أُمِرُوا إِلَّا لِيَعْبُدُوا إِلَٰهًا وَاحِدًا لَا إِلَٰهَ إِلَّا هُوَ سُبْحَانَهُ عَمَّا يُشْرِكُونَ۔

ان لوگوں نے اپنے علماء اور مشائخ کو اللہ کے سوا اپنا رب بنالیا ہے۔ خصوصاً مسیح ابن مریم کو۔ حالانکہ انھیں صرف یہ حکم دیا گیا تھا کہ ایک معبود کی عبادت کریں جس کے سوا کوئی دوسرا معبود ہے ہی نہیں، پاک و برتر ہے اللہ اس چیز سے جس کو یہ خدا کا شریک ٹھہراتے ہیں۔

یہود کے بارے میں فرمایا کہ:۔

أَفَكُلَّمَا جَاءَكُمْ رَسُولٌ بِمَا لَا تَهْوَىٰ أَنْفُسُكُمُ اسْتَكْبَرْتُمْ فَفَرِيقًا كَذَّبْتُمْ وَفَرِيقًا تَقْتُلُونَ۔

تو کیا جب کبھی کوئی رسول تمھاری خواہشوں کے خلاف کوئی پیغام لے کر آئے گا تو تم خود سری کرو گے۔ چنانچہ ان میں سے کچھ کو تم نے جھٹلا دیا اور کچھ کو...

سَأَصْرِفُ عَنْ آيَاتِيَ الَّذِينَ يَتَكَبَّرُونَ فِي الْأَرْضِ بِغَيْرِ الْحَقِّ وَإِنْ يَرَوْا كُلَّ آيَةٍ لَا يُؤْمِنُوا بِهَا وَإِنْ يَرَوْا سَبِيلَ الرُّشْدِ لَا يَتَّخِذُوهُ سَبِيلًا وَإِنْ يَرَوْا سَبِيلَ الْغَيِّ يَتَّخِذُوهُ

میں اپنی آیتوں (پر ایمان لانے) سے ان لوگوں کو دور ہی رکھوں گا جو زمین میں بغیر کسی استحقاق کے بڑے بنتے ہیں۔ اور اگر یہ لوگ ہر ایک نشانی دیکھ لیں جب بھی ان پر ایمان نہ لائیں گے، اور اگر ہدایت کا راستہ دیکھے

سَبِيْلًا۔ میں تو اسکو اپنا راستہ نہیں بناتے لیکن اگر گمراہی کی راہ دیکھ پائیں تو اُسکی طرف چل پڑتے ہیں۔

ہر نبی کا دین اسلام تھا چونکہ کبر شرک کو مستلزم ہے اور شرک اسلام کی ضد ہے اور گناہ عظیم ہے جس کی معافی کا بارگاہ احدیت میں حسب اعلان قرآنی کوئی امکان نہیں، اس لیے ابتدائے آفرینش سے آج تک جتنے انبیاء آئے، سب اسی دین "اسلام" کو لے کر آئے، اس لیے تنہا یہی وہ دین ہے جو اللہ تعالیٰ کے نزدیک مقبول ہے۔ نوح علیہ السلام نے اپنی قوم کو مخاطب کرکے فرمایا:۔

فَاِنْ تَوَلَّوْا فَمَا سَاَلْتُكُمْ مِّنْ اَجْرٍ اِنْ اَجْرِيَ اِلَّا عَلَى اللّٰهِ وَاُمِرْتُ اَنْ اَكُوْنَ مِنَ الْمُسْلِمِيْنَ۔

اگر تم میری بات ماننے سے انکار کرتے ہو تو جائے تعجب ہے، اس میں میرا کوئی نقصان نہیں کیونکہ) میں تم سے کسی اجر کا طالب نہیں، میرا اجر تو اللہ کے ذمہ ہے اور مجھے حکم ہے کہ میں "اسلام" لانے والوں میں سے بنوں۔

ابراہیم علیہ السلام کی دعوت وارشاد اور طرز عمل کے متعلق قرآن میں ہے کہ:۔

اِذْ قَالَ لَهٗ رَبُّهٗٓ اَسْلِمْ قَالَ اَسْلَمْتُ لِرَبِّ الْعٰلَمِيْنَ۔ وَوَصّٰى بِهَآ اِبْرٰهٖمُ بَنِيْهِ وَيَعْقُوْبُ۔ يٰبَنِيَّ اِنَّ اللّٰهَ اصْطَفٰى لَكُمُ الدِّيْنَ فَلَا تَمُوْتُنَّ اِلَّا وَاَنْتُمْ مُّسْلِمُوْنَ۔

جب اس کے پروردگار نے اس سے کہا کہ "مسلم" (اطاعت گزار) بن جا تو اس نے جواب دیا کہ میں نے پروردگار کائنات کے لیے اپنی گردن جھکا دی اور پھر اسی امر کی اس نے اپنے بیٹوں اور یعقوب کو وصیت کی کہ اے میرے بیٹو! اللہ نے تمہارے لیے اس دین کو پسند فرمایا ہے سو تم مرتے دم تک مسلم (اللہ کے اطاعت گزار) رہنا۔

یوسف علیہ السلام فرماتے ہیں:۔

تَوَفَّنِيْ مُسْلِمًا وَّاَلْحِقْنِيْ بِالصّٰلِحِيْنَ۔

خدایا! مجھ کو دنیا سے "مسلم" اٹھا اور نیکوکاروں کے زمرہ میں داخل کر۔

موسیٰ علیہ السلام اپنی قوم سے خطاب کرتے ہیں:۔

يٰقَوْمِ اِنْ كُنْتُمْ اٰمَنْتُمْ بِاللّٰهِ فَعَلَيْهِ تَوَكَّلُوْٓا اِنْ كُنْتُمْ مُّسْلِمِيْنَ۔

اے میری قوم کے لوگو! اگر تم اللہ پر ایمان رکھتے ہو تو اسی پر بھروسہ کرو اگر تم "مسلم" ہو۔

توراۃ کے متعلق اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ تمام انبیاء بنی اسرائیل، جو توراۃ کی شریعت کے مبلغ اور پیرو تھے، ان کا دین یہی اسلام تھا۔ اِنَّآ اَنْزَلْنَا التَّوْرٰىةَ فِيْهَا هُدًى وَّنُوْرٌ يَحْكُمُ بِهَا النَّبِيُّوْنَ الَّذِيْنَ اَسْلَمُوْا لِلَّذِيْنَ هَادُوْا۔

بلقیس کے سامنے جب صداقت کی تجلی چمکی تو پکار اٹھی:۔

رَبِّ اِنِّىْ ظَلَمْتُ نَفْسِىْ وَاَسْلَمْتُ مَعَ سُلَيْمٰنَ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ۔

مالک! یقیناً میں نے اب تک اپنے اوپر بڑا ہی ظلم کیا، اور اب سلیمان کے ساتھ تمام جہانوں کے پروردگار اللہ کی "مسلم" بنتی ہوں۔

حواریین عیسیٰ کے متعلق اللہ تعالیٰ کہتا ہے:۔

وَاِذْ اَوْحَيْتُ اِلَى الْحَوَارِيّٖنَ اَنْ اٰمِنُوْا بِيْ وَبِرَسُوْلِيْ۔ قَالُوْٓا اٰمَنَّا وَاشْهَدْ بِاَنَّنَا مُسْلِمُوْنَ۔

اور جب میں نے حواریوں کو وحی کی کہ مجھ پر اور میرے رسول پر ایمان لاؤ تو انھوں نے جواب دیا ہم ایمان لائے اور اے خدا تو گواہ رہ کہ ہم "مسلم" ہیں۔

قرآن حکیم کی ان تصریحات سے یہ حقیقت بالکل واضح ہو جاتی ہے کہ ہر پیغمبر کا دین اسلام تھا۔ یہی وجہ ہے کہ خداوند تعالیٰ کا یہ اعلان ہے

کہ اسلام کی شاہراہ ہی وہ تنہا شاہراہ ہے جو ربّی بارگاہِ قبولیت تک پہنچاتی ہے۔

اِنَّ الدِّیْنَ عِنْدَ اللّٰہِ الْاِسْلَامُ۔ — بے شک دین تو اللہ کے نزدیک صرف اسلام ہے۔

وَمَنْ یَّبْتَغِ غَیْرَ الْاِسْلَامِ دِیْنًا فَلَنْ یُّقْبَلَ مِنْہُ — اور جس شخص نے اسلام کے سوا کوئی دوسرا دین اختیار کیا اس کا دین ہرگز قبول نہ کیا جائے گا۔

اسلام دینِ کائنات ہے نہ صرف یہ کہ ہر نبی اسلام لے کر آیا اور تمام بنی آدم کا یہی دین رہا ہے بلکہ اسلام ساری کائنات کا دین ہے۔ قرآن کہتا ہے:-

اَفَغَیْرَ دِیْنِ اللّٰہِ یَبْغُوْنَ وَلَہٗۤ اَسْلَمَ مَنْ فِی السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ طَوْعًا وَّکَرْھًا۔ — کیا یہ لوگ اللہ کے دین کو چھوڑ کر کوئی اور دین چاہتے ہیں، حالانکہ آسمانوں اور زمین میں جو کوئی بھی ہے، چار و ناچار اسی کے سامنے سرنگندہ ہے۔

"طَوْعًا وَّکَرْھًا" کی قید کل کائنات کے اسلام میں اس وجہ سے لگائی ہے کہ تمام مخلوقات اللہ تعالیٰ کی مکمل تابع اور زیرِ فرمان ہیں خواہ کوئی اس فرماں برداری کا اقرار کرے یا نہ کرے، نیز تمام لوگ اس کے سامنے عاجز محض ہیں اور اس کے دستِ تصرف و تدبیر میں ہیں، اس کے فرامینِ مشیت اور احکامِ تدبیر سے یک سر سر موانحراف کسی کے لیے ممکن ہی نہیں، اس لیے چار و ناچار سب ہی اس کے مسلم اور مطیع و منقاد ہیں، ساری طاقتوں اور قدرتوں کا سرچشمہ اسی کی ذات ہے، ایک ذرہ سے لے کر آفتاب تک ہر چھوٹی بڑی چیز کا پروردگار وہی ہے، جس طرح چاہتا ہے ان میں بلا روک ٹوک تصرف کرتا رہتا ہے، سب کا پیدا کرنے والا، سب کو وجود بخشنے والا اور سب کی صورتیں بنانے والا وہی ہے۔ اس جہانِ ہستی میں اس کے سوا جو کچھ ہے سب کا سب مخلوق ہے، مربوب ہے، محتاج ہے، فقیر ہے، غلام ہے، مجبور ہے، مقہور ہے اور ہر حیثیت سے تحت ہے۔ اللہ ہی اکیلا ہر شے کا خالق اور معبود ہے۔ اگرچہ ہر چیز کو بھی اس نے پیدا کیا ہے، اسباب کے ساتھ پیدا کیا ہے لیکن ان اسباب کا خالق اور صاحبِ تقدیر بھی وہی ہے، اس لیے وہ اسباب بھی اسی طرح اس کے محتاج ہیں۔ اور اس عالمِ کون و فساد میں کوئی سبب بھی اپنی تاثیر میں مستقل بالذات نہیں ہے بلکہ ہر سبب ایک دوسرے سبب کا دستِ نگر رہتا ہے جس کی اعانت کے بغیر وہ اپنا عمل اور اثر ظاہر نہیں کر سکتا۔ یہ سبب یعنی علت، العلل ذاتِ باری تعالیٰ ہے جو اسباب و علل سے مافوق اور ہر شے سے بے نیاز ہے جس کا نہ تو کوئی شریک ہے کہ اس کی اعانت کرے، نہ کوئی مقابل ہے جو میدانِ مقابلہ میں اس کے سامنے آئے۔

قُلْ اَفَرَءَیْتُمْ مَّا تَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰہِ اِنْ اَرَادَنِیَ اللّٰہُ بِضُرٍّ ھَلْ ھُنَّ کٰشِفٰتُ ضُرِّہٖۤ اَوْ اَرَادَنِیْ بِرَحْمَۃٍ ھَلْ ھُنَّ مُمْسِکٰتُ رَحْمَتِہٖ قُلْ حَسْبِیَ اللّٰہُ عَلَیْہِ یَتَوَکَّلُ الْمُتَوَکِّلُوْنَ۔ — اے نبی! ان سے کہو کہ کیا تم نے ان کے حال پر کچھ غور کیا جن کو خدا کو چھوڑ کر تم پوجتے ہو؟ اگر اللہ مجھے کوئی نقصان پہنچانا چاہے تو کیا یہ اس کے نقصان کو دور کر سکتی ہیں؟ یا اگر خدا مجھ پر کوئی رحمت کرنی چاہے تو کیا یہ اس کی رحمت کو روک سکتی ہیں؟ کہہ دو کہ اللہ میرے لیے کافی ہے۔ اسی پر بھروسہ رکھنے والوں کو بھروسہ رکھنا چاہیے۔

اس طرح کی بے شمار آیتیں قرآن میں موجود ہیں جو شہادت دیتی ہیں کہ ہر فعل اور ہر سبب فعل کی باگ ڈور مشیتِ الٰہی کے ہاتھوں میں ہے۔ حضرت ابراہیم خلیل نے اپنی قوم کی کٹ حجتیوں اور دھمکیوں کے جواب میں اسی حقیقت تامہ کو پیش فرمایا تھا کہ "میں تمہارے شریک ٹھہرائے ہوئے معبودانِ باطل سے ڈرنے والا نہیں، ہاں اگر میرے پروردگار ہی کی مشیت کچھ اس قسم کی ہو تو اور بات ہے۔"

ابراہیم خلیل عبدیت کاملہ کا نمونہ | عبدیت کے سلسلہ میں حضرت ابراہیم ایک امتیازی شان اور اسوۂ کمال رکھتے ہیں، خدا کی ساری زمین دین شرک کی ظلمتوں سے تاریک ہو رہی تھی کہ توحید، عبودیت اور اخلاص کا یہ نورانی پیکر حق پرستوں اور مخلصوں کا امام بن کر نمودار ہوا جس کی عبدیت کاملہ کا خود معبود کو اعتراف ہے :۔

وَاِذِ ابْتَلٰۤى اِبْرٰهٖمَ رَبُّهٗ بِكَلِمٰتٍ فَاَتَمَّهُنَّ ؕ قَالَ اِنِّىْ جَاعِلُكَ لِلنَّاسِ اِمَامًا ؕ قَالَ وَمِنْ ذُرِّيَّتِىْ ؕ قَالَ لَا يَنَالُ عَهْدِى الظّٰلِمِيْنَ ۔

اور جب ابراہیم کو اس کے رب نے چند باتوں میں آزمایا اور اس نے ان کو پورا کر دیا تو پروردگار نے فرمایا کہ میں تجھ کو لوگوں کا پیشوا بناؤں گا، ابراہیم نے کہا اور میری اولاد میں سے؟ جواب ملا کہ میرا وعدہ ظالموں کے لیے نہیں

دیکھو یہاں بھی اللہ تعالیٰ نے غیر مبہم طریقہ پر اس امر کی تصریح کر دی ہے کہ یہ وعدۂ امامت صرف مومنوں اور حدود عبدیت کی حفاظت کرنے والوں کے لیے ہے۔ ظالموں اور حدود الٰہی سے تجاوز کرنے والوں کے لیے نہیں ہے، اور سب سے بڑا ظلم شرک ہے۔ اِنَّ الشِّرْكَ لَظُلْمٌ عَظِيْمٌ۔ پس ظالموں اور مشرکوں کو یہ رتبہ حاصل نہیں ہو سکتا کہ وہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے قوموں کی امامت کے منصب پر سرفراز کیے جائیں۔

حضرت ابراہیم علیہ السلام کو امامتِ اقوام کا شرف کمال عبودیت کی آزمائش میں کامیاب ثابت ہونے پر ملا تھا، چنانچہ آپ کو خدا پرستی کا اسوہ اور پیشوا قرار دیا گیا اور آپ کی نسل کو اللہ تعالیٰ نے نبوت کی نعمتِ عظمیٰ سے نوازا، اور آپ کے بعد جو نبی بھی مبعوث ہوا آپ ہی کی ملت پر مبعوث ہوا۔ اَنِ اتَّبِعْ مِلَّةَ اِبْرٰهِيْمَ حَنِيْفًا۔ (اے نبی یکسو ہو کر ملتِ ابراہیمی کی پیروی کر)۔ دوسری جگہ یہود و نصاریٰ کی نسبت فرمایا کہ اللہ تعالیٰ کی ہدایت کو یہودیت و نصرانیت کی گروہ بندی سے کوئی علاقہ نہیں، اللہ تعالیٰ کی ہدایت تو ملتِ ابراہیمی کی پیروی میں ہے۔ بَلْ مِلَّةَ اِبْرٰهٖمَ حَنِيْفًا۔

حدیث میں حضرت ابراہیم کی شان میں فرمایا گیا ہے کہ "ابراہیم خیر البریہ ہیں" معلوم ہوا کہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد آپ تمام مخلوق اور تمام انبیاء سے افضل ہیں، چنانچہ دربار خداوندی سے آپ کو "خلیل اللہ" کا خطاب عطا ہوا ہے جس سے بڑا کوئی خطاب عزت کا نہیں ہے۔

خلت کا مفہوم | اس امر کی دلیل کہ "خلیل" سے بڑھ کر کوئی خطاب نہیں، خود "خلیل" اور "خلت" کے الفاظ کی تہوں میں پوشیدہ ہے۔ "خلت" نام ہے بندہ کی خدا کے ساتھ انتہائی محبت کا، جو کمال عبودیت کو مستلزم ہو نیز بندہ کے ساتھ خدا کی اس کامل محبت کا جو بندے کے لیے اس کی کامل ربوبیت کو لازم ہو۔ اور لفظ "عبودیت" جیسا کہ آغاز بحث میں تفصیل کے ساتھ بتلایا جا چکا ہے، انتہائی تذلل اور انتہائی محبت کے مجموعہ کا نام ہے۔ پس مقام خلت، محبت کے مقام سے بلند تر ہوا۔ اور یہی وہ اعلیٰ کمال ہے جو حضرت ابراہیم اور حضرت محمد علیہما السلام کو اللہ تعالیٰ کے دربار سے مرحمت ہوا تھا اور یہی وجہ ہے کہ حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا اس زمین پر بسنے والوں میں سے کوئی خلیل نہ تھا، جیسا کہ آپ نے فرمایا ہے کہ "اگر میں اہل ارض میں سے کسی کو اپنا خلیل منتخب کرتا تو وہ ابوبکر ہوتے لیکن میں تو اللہ تعالیٰ کا خلیل ہو چکا ہوں" معلوم ہوا کہ انسان کسی ایک ہی کا خلیل بن سکتا ہے اور خلت قابل شرکت چیز نہیں، خلت کے مفہوم کو کسی نکتہ داں شاعر نے کس خوبی کے ساتھ واضح کیا ہے :۔

قد تخللت مسلک الروح منی ۔۔۔ و بہٖ سمی الخلیل خلیلا

(اے میری محبوبہ میری روح کے ایک ایک ریشہ میں تخلل پذیر ہو گئی ہے (یعنی چھا گئی ہے)، اسی وجہ سے خلیل کو خلیل کہتے ہیں۔)

محبت اور خلت میں فرق محبت اور خلت میں یہی فرق و امتیاز ہے کہ خلت شرکت غیر کی تحمل اور روادار نہیں لیکن محبت میں یہ بات نہیں پائی جاتی۔ خلت صرف ایک سے ہو سکتی ہے اور محبت ایک کے سوا دوسروں سے بھی ہو سکتی ہے۔ چنانچہ رسول اکرم صلعم نے اللہ تعالےٰ سے رشتۂ خلت رکھنے کے باعث کسی ماسوا کو اپنا خلیل بنانے سے انکار فرمایا، مگر اللہ تعالےٰ سے محبت رکھنے کے باوجود بہت سے لوگوں کو اپنا حبیب قرار دیا۔ مثلاً حضرت حسنؓ اور حضرت اسامہؓ کے متعلق فرمایا کہ "خدایا! میں ان سے محبت رکھتا ہوں سو تو بھی ان سے محبت رکھ"۔ اسی طرح عورتوں میں سے حضرت عائشہؓ کو اور مردوں میں سے حضرت ابوبکرؓ کو آپ نے اپنا سب سے بڑھ کر محبوب قرار دیا۔ کلام رسول کے بعد کلام الٰہی پر نظر ڈالیے تو جگہ جگہ دکھائی پڑتا ہے کہ "اللہ متقیوں سے محبت کرتا ہے"، "اللہ محسنوں سے محبت رکھتا ہے"، "اللہ توبہ کرنے والوں سے محبت رکھتا ہے"، "اللہ ایسے لوگوں کو لائے گا جن کو وہ محبوب رکھتا ہو گا اور جو اس کو محبوب رکھتے ہوں گے"۔ گویا اللہ تعالیٰ بتانا چاہتا ہے کہ سچے مومن وہ ہوتے ہیں جن سے خدا محبت رکھتا ہے اور جو خدا سے محبت رکھتے ہیں۔ دوسری جگہ فرمایا "ایمان والے سب سے زیادہ خدا سے محبت رکھنے والے ہوتے ہیں"۔ جس سے ثابت ہوا کہ مومن صالح اگرچہ سب سے زیادہ خدا ہی سے محبت رکھتا ہے مگر دوسروں سے بھی محبت رکھ سکتا ہے جس کا لازمی اور منطقی نتیجہ یہ نکلا کہ محبت میں وحدت ضروری نہیں۔ بخلاف خلت کے۔

ایک خیال عام کی تردید عام طور پر یہ خیال پھیلا ہوا ہے کہ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم اللہ کے حبیب تھے اور حضرت ابراہیم اللہ کے خلیل تھے، اور یہ کہ محبت کا مقام خلت کے مقام سے مافوق ہے۔ لیکن یہ خیال کوئی مضبوط بنیاد نہیں رکھتا۔ کیونکہ احادیث صحیحہ سے یہ اچھی طرح ثابت ہے کہ آنحضرت بھی خلیل اللہ تھے۔ صحیح بخاری اور مسلم دونوں میں یہ روایت موجود ہے اور مختلف طرق واسانید کے ساتھ موجود ہے کہ پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:۔

"یہ حقیقت ہے کہ اللہ تعالیٰ نے مجھ کو اپنا خلیل بنایا ہے جیسا کہ ابراہیم کو اپنا خلیل بنایا تھا۔"

ایک دوسری حدیث اوپر گذر چکی ہے جس میں آپ نے فرمایا ہے کہ میں اللہ کا خلیل ہو چکا ہوں اور اب کسی اور کو خلیل بنانے کا موقع و محل باقی نہیں رہا۔

لذت اور حلاوت ایمانی ہم پہلے بیان کر آئے ہیں کہ محبت الٰہی سے مراد یہ ہے کہ ان چیزوں سے محبت کی جائے جو اللہ تعالیٰ کو محبوب ہیں۔ محبت الٰہی کی یہ تاویل ہم نے نصوص شرعیہ کی روشنی میں کی ہے۔ اس سلسلہ میں صحیحین کی مذکورہ بالا حدیث کے پر حکمت الفاظ پر دوبارہ غور کیجیے جس میں فرمایا گیا ہے کہ "تین چیزیں ہیں کہ جس کسی کے اندر یہ تینوں موجود ہوں گی وہی حلاوت ایمانی سے شادکام ہو گا۔۔۔ الخ"۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ کسی چیز سے لذت یابی، اس کی محبت کے بعد ہوتی ہے۔ یعنی اگر ایک شخص کسی چیز کی محبت و آرزو رکھتا ہے تو جس وقت وہ چیز اس کو حاصل ہوتی ہے وہ ایک کیفیت، ایک حلاوت، ایک لذت اور ایک سرور محسوس کرتا ہے۔ اور لذت اس خاص کیفیت کا نام ہے جو کسی موافق طبع شے یعنی کسی مرغوب و محبوب شے کے ادراک اور حصول کے بعد پیدا ہوتی ہے۔ اور بعض خام کار فلسفیوں اور طبیبوں کا یہ خیال کہ لذت شے مرغوب کے نفس ادراک و حصول ہی کا نام ہے، ایسا پھسپھسا اور بے اصل ہے کہ جس کی تردید کی بھی ضرورت نہیں۔ کیونکہ "یہ ادراک اور حصول" تو رغبت اور لذت کی بیچ کی کڑی ہے نہ کہ نفس لذت۔ مثال کے طور پر کھانے کا مسئلہ لیجیے۔ کھانا انسان کی ایک مرغوب چیز ہے اور جب وہ اس کھانے کو کھا لیتا ہے تو ایک لذت محسوس کرتا ہے۔ پھر یہ کہنا کس قدر غلط ہے کہ کھانا کھانا ہی لذت ہے۔ اسی طرح قوت باصرہ کو لیجیے، جب انسان کسی محبوب شے کی طرف دیکھتا ہے تو دیکھنے کے بعد اس سے لذت پاتا ہے۔ معلوم ہوا کہ لذت کا حصول دیکھنے اور نظر ڈالنے کے بعد ہوتا ہے اس لیے نظر اور چیز ہوئی اور لذت اور چیز جو نظر کے بعد وجود میں آتی ہے۔ قرآن کے الفاظ بھی اسی حقیقت کی شہادت دیتے ہیں:۔

وَفِيهَا مَا تَشْتَهِيهِ الْأَنْفُسُ وَتَلَذُّ الْأَعْيُنُ اور اس بہشت میں وہ نعمتیں ہیں جن کی دلوں کو آرزو ہوگی اور جن سے آنکھیں لذت گیر ہوں گی۔

معلوم ہوا کہ نفس نظر اور رویت کا نام لذت نہیں ہے ورنہ یوں نہ فرمایا جاتا کہ "آنکھیں ان کو دیکھ کر لذت گیر ہوں گی"۔

یہی حال تمام احساسات نفس کا ہے۔ نفس کو جو خوشی یا غم وغیرہ کیفیات لذت والم محسوس ہوتی ہیں وہ کسی نہ کسی شے محبوب یا امر مکروہ کے شعور و ادراک کا نتیجہ ہوتی ہیں نہ کہ نفس شعور و ادراک۔ پس ایمان کی حلاوت اور پھر اس کے ساتھ لذت و سرور کا حصول خدا کے ساتھ کامل محبت کے ساتھ ہو پیدا ہوتا ہے۔ اور یہ مقام تین چیزوں میں پورا اترنے کے بعد ہاتھ آتا ہے۔ ایک تو اس محبت کی تکمیل، دوسری اس محبت کی تفریع، تیسری اس محبت کی ضد سے نفرت اور مدافعت۔ تکمیل محبت کا مطلب یہ ہے کہ اللہ اور رسول ساری موجودات سے زیادہ محبوب ہوں، کیونکہ جیسا کہ پہلے گذر چکا، اللہ اور اس کے رسول کی محبت کے باب میں صرف اتنی بات کافی نہیں ہے کہ نفی اجمال سے محبت رکھی جائے بلکہ یہ ضروری ہے کہ ان کی محبت سب سے زیادہ ہو۔ اور تفریع محبت کا مدعا یہ ہے کہ اگر بندہ کسی انسان کی محبت کرے تو وہ محبت بھی للہ ہو، بالاصل نہ ہو۔ اور دفع ضد کا مفہوم یہ ہے کہ ضد ایمان — کفر و شرک — کو آگ میں پڑنے سے بڑھ کر ناپسندیدہ کر سمجھے۔

جب یہ بات معلوم ہو گئی کہ رسول خدا اور مومنوں کی محبت بھی دراصل خدا کی محبت ہے یعنی اسی کا ایک جزیا پرتو ہے اور رسول خدا صلعم ان مومنوں سے محبت رکھتے تھے جن کو اللہ تعالیٰ نے اپنی محبت کے انعام سے سرفراز کیا تھا، اور اسی وجہ سے رسول کو ان سے محبت تھی کیونکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو اللہ تعالیٰ سے سب سے زیادہ محبت تھی اس لیے لازماً اللہ کے محبوبوں کی محبت اور اس کے مبغوضوں کا بغض بھی آپ کے قلب مبارک میں سب سے زیادہ ہونا ہی چاہیے تھا۔ لیکن محبت کے بالمقابل خلت کا حال دیکھیے کہ کس طرح اس میں غیر اللہ کے لیے ایک شمہ بھی حصہ نہیں نہ اصالتاً نہ تبعاً، بلکہ وہ اللہ ہی کے لیے مخصوص ہے۔ جس سے محبت مطلق پر خُلت کی فضیلت روز روشن کی طرح عیاں ہوتی ہے۔

محبت الٰہی کے مفہوم میں افراط و تفریط

خلاصہ کلام یہ کہ خدا کی محبت اور خلت ہی میں عبودیت الٰہی کی حقیقت پوشیدہ ہے۔ لیکن کتنے ہی اہل علم و نظر ایسے ہیں جو اس حقیقت سے دور جا پڑے۔ ان کا گمان ہے کہ عبودیت تو صرف تذلل اور خضوع کا ایک خشک وظیفہ ہے، اس میں محبت کی چاشنی کہاں؟ محبت تو ایک کی قلبی تمناؤں کی انبساطی کیفیت کا اور دوسرے کی طرف سے ناز و انداز کے اظہار کا نام ہے، اور ربوبیت اس قسم کی چیزوں سے ماوراء ہے، پھر یہ کیونکر ہو سکتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کو ایک محبوب یا محب کی حیثیت دی جائے۔ یہی وجہ ہے کہ جب حضرت ذوالنون مصری کے سامنے محبت الٰہی کا ذکر چھڑ گیا تو آپ نے فرمایا کہ "خاموش رہو، اس مسئلہ پر گفتگو مت کیا کرو، کہیں ایسا نہ ہو کہ عام لوگوں کے کانوں تک یہ بات پہنچے اور وہ محبت الٰہی کا ادعا کرنے لگیں"۔ چنانچہ بعض علما نے ایسے لوگوں کے ساتھ اٹھنا بیٹھنا مکروہ قرار دیا ہے جو اللہ تعالیٰ کی خشیت کا ذکر و تصور کیے بغیر صرف اس کی محبت کی باتیں کرتے رہتے ہیں۔ اس معاملہ میں ایک بزرگ کا قول لوح دل پر آب زر سے لکھنے کے قابل ہے جنھوں نے فرمایا کہ جو شخص خدا کی عبادت صرف محبت کے ساتھ کرتا ہے وہ زندیق ہے اور جو صرف رجا کے ساتھ کرتا ہے وہ مرجی ہے اور جو صرف خوف کے ساتھ کرتا ہے وہ حروری ہے۔ مومن موحد وہ ہے جس نے خدا کی عبادت محبت، خوف اور رجا تینوں کے ساتھ کی۔ واقعات اس حکیمانہ نکتہ کی گواہی دے رہے ہیں۔ صوفیائے متاخرین میں ایسے لوگ پائے جاتے ہیں جنھوں نے ادعائے محبت میں حدود کو فراموش کر دیا، آپے سے باہر نکل گئے یہاں تک کہ ان میں ایک طرح کی رعونت پیدا ہو گئی اور وہ ایسے دعوے

کہ یہ جو عبدیت کے منافی ہیں اور جن میں ایسی شانِ پروردگاری پائی جاتی ہے جو اللہ جل مجدہٗ کے سوا کسی کے شایانِ شان نہیں۔ انھوں نے اپنے کو اس مقام پر ظاہر کیا جو نبوت و رسالت کے مقام سے بھی بالاتر ہے اور اپنے لیے خدا سے ایسی صفات کا مطالبہ کر گئے جو خدا ہی کے لیے مخصوص ہیں، اور جو انبیاء و رسل کے لیے بھی موزوں نہیں۔

یہ وہ خطرناک غلطی ہے جس سے شیطانی جال نے بڑے بڑے شیوخِ طریقت کو شکار کر لیا۔ اس کا سبب عبودیت کی حقیقت تک فہم کی نارسائی اور تحقیقِ عبادت کی کمی ہے۔ بلکہ دراصل یوں کہنا چاہیے کہ اس کا باعث اس عقل کی کوتاہی ہے جس کے بغیر ایک بندہ اپنی حقیقت پہچان نہیں سکتا۔ پس جب عقل خام کار ہوتی ہے، اور دین کا علم پوری طرح حاصل نہیں رہتا، تو ایسی حالت میں اگر نفس میں محبت کے جذبات پیدا ہو جاتے ہیں تو نفس اپنی نادانی کے باعث اپنے آپ سے باہر ہو جاتا ہے، اس کو اپنی حدود یاد نہیں رہتیں، جیسا کہ عشقِ مجازی میں اس انسانی فطرت کا مشاہدہ ہم جب چاہیں کر سکتے ہیں۔ پھر جب نفس اس فریبِ شیطانی کا شکار ہو جاتا ہے تو اس کی زبان سے بڑے بول نکلنے لگتے ہیں، وہ علانیہ کہنے لگتا ہے کہ میں تو عاشقِ خدا ہوں، میں جو چاہوں کروں، مجھ پر کوئی گرفت نہیں۔ لیکن یہ اصلی اور کھلی ہوئی گمراہی ہے اور بالکل وہی بات ہے جو یہود اور نصاریٰ کی زبانوں سے نکلی تھی کہ "ہم تو خدا کے بیٹے اور اس کے محبوب ہیں"۔ اور اس کا جواب خدا نے یہ دیا کہ تم اس کے بیٹے اور پیارے ہونے کا دعویٰ تو کرتے ہو مگر یہ تو بتاؤ کہ وہ تمھیں عذاب پر عذاب کیوں دیا کرتا ہے؟ کیا ابنیت اور محبوبیت کی یہی علامتیں ہیں؟ پس یہ نفس کا ایک خطرناک فریب ہے۔ درحقیقت جو بندہ کہ اللہ کا محبوب ہوتا ہے اس کو وہ صرف ایسے ہی کاموں میں لگاتا ہے جو اس کی رضا کے موجب ہوں، وہ کبھی ایسے کام نہیں کرتا جو اس کی ناراضی کا سبب ہیں۔ اور جو گناہ کا ارتکاب کرتا ہے اور نافرمانیوں پر نافرمانیاں کرتا جاتا ہے، اللہ تعالیٰ اس کے ان افعالِ بد کو اسی طرح نفرت اور غضب کی نگاہ سے دیکھتا ہے جس طرح اس کے اعمالِ نیک کو قدر و محبت کی نظر سے، کیونکہ خدا کسی بندے سے اتنی ہی محبت کرتا ہے جتنا کہ اس میں ایمان اور تقویٰ ہے۔

ٹھیک اس شخص کی مثال، جو گمان کرتا ہے کہ محبوبِ خدا ہونے کے باعث اس کو گناہ کوئی نقصان نہیں پہنچا سکتے، اس خفیف فہم کی سی ہے جو یہ کہتا ہو کہ چونکہ میرا مزاج معتدل اور میری صحتِ جسمانی بالکل ٹھیک ہے اس لیے خواہ میں زہر بھی کیوں نہ کھاتا رہوں لیکن اس سے میرا کچھ نہیں بگڑ سکتا۔ اگر یہ عقل کا دشمن قرآن پر نظر ڈالتا اور انبیاء کے احوال و قصص کو تدبر کی نگاہ سے دیکھتا کہ کس طرح نوعِ انسانی کے ان سرتاجوں کو بھی کبھی توبہ و استغفار کی ضرورت پیش آ ہی گئی اور خدا کے ان محبوب ترین بندوں کو بھی اپنے اپنے حالات کے مطابق تزکیۂ نفس کی خاطر ابتلاؤں اور مصیبتوں کی چکی سے گزرنا ہی پڑا، تو اسے معلوم ہو جاتا کہ گناہ کے نقصانات اپنی ضرر رسانی میں کتنے مستعد اور اپنی اثر اندازی میں کتنے بے رحم واقع ہوئے ہیں کہ کسی بڑے سے بڑے مقرب بندہ کو بھی نہیں بخشتے۔ پھر یہ بات بھی عین مقتضائے فطرت ہے۔ خود انسان، انسان کے تعلقات میں اس اصول کی کارفرمائی مشاہدہ کی جا سکتی ہے۔ ایک وجودِ انسانی کا عاشق اگر اپنے محبوب کی مرضی اور مصلحت سے واقف نہ ہو اور اس کے مطابق طریقِ کار اختیار نہ کرے بلکہ صرف اپنے جذباتِ عشق کے اشاروں پر رقص کرتا رہے تو بالیقین اس کا یہ رویہ اپنے محبوب کی نفرت اور ناراضی کا، بلکہ عداوت اور تعذیب تک کا موجب ہو جاتا ہے۔

لیکن بدقسمتی سے کتنے ہی اہلِ سلوک ایسے گزرے ہیں جو محبتِ الٰہی کے زعم میں طرح طرح کی خلافِ دین باتیں بنا کر گئے۔ کہیں تو حدود اللہ کی پاسداری فراموش کر دی گئی، کہیں حقوق اللہ کو پسِ پشت ڈال دیا گیا، اور کہیں بے سر و پا اور باطل دعاوی کر دیے گئے۔ کوئی صاحب فرما گئے کہ "میرے جس کسی مرید نے ایک شخص کو بھی دوزخ میں رہنے دیا، اس سے میں بری ہوں"۔ کسی نے اعلان کیا

کہ "جس کسی مرید نے ایک مومن کو بھی دوزخ میں جانے دیا میں اس سے بیزار ہوں" ایک تیسرے صاحب یہ فرما گئے کہ "قیامت کے دن میرا خیمہ جہنم کے دروازے پر نصب رہے گا تاکہ ایک شخص بھی اس کے اندر داخل نہ ہونے پائے"۔ یہ اور اسی طرح کے بے شمار اقوال بعض مشہور و معروف مشائخ کی بابت بیان کیے جاتے ہیں، جو یا تو ان بزرگوں پر بہتان اور افترائے محض ہیں یا اگر انھیں کے اقوال ہیں تو یقیناً وہ سخت غلط ہیں جو ہوش کی باتیں نہیں بلکہ حالت سکر یا غلبہ یا فنا کی باتیں ہیں جس میں انسان ہوش اور تمیز کھو بیٹھتا ہے یا کم از کم اس کی تمیز اتنی کمزور ہوجاتی ہے کہ وہ نہیں جان سکتا کہ میرے منہ سے کیا نکل رہا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان میں ایسے لوگ بھی ہیں جنھوں نے حالت خاص کے زائل ہونے اور ہوش و تمیز بجا ہو جانے کے بعد اس قسم کی باتوں سے توبہ و استغفار کیا۔ یہی صورت حال ان صوفیا کے بارے میں بھی پیش آئی ہے جنھوں نے عشقیہ قصائد سننے میں اپنے لیے گنجائش پیدا کی۔

ان لغزشوں کا علاج اور محبت کا معیار

عشق و محبت کی راہ کے یہی وہ خطرات اور مزلّات تھے جن سے بچانے کے لیے اللہ تعالیٰ نے محبت کی ایک کسوٹی مقرر فرما دی ہے تاکہ ہر مدعی کا دعوائے محبت اس پر پرکھ کر دیکھا جاسکے، فرمایا:۔

اِنْ كُنْتُمْ تُحِبُّوْنَ اللّٰهَ فَاتَّبِعُوْنِيْ يُحْبِبْكُمُ اللّٰهُ — اگر تم واقعی خدا سے محبت رکھنے والے ہو تو میرا اتباع کرو اللہ تم کو محبوب رکھے گا

گویا وہی شخص خدا کی محبت کا سچا دعویدار کہا جا سکتا ہے جو اس کے رسول کے ایک ایک نقش قدم کو اپنا اُسوہ بناتا ہے۔ اور یہ حقیقت کسی بحث یا تشریح کی محتاج نہیں کہ رسول کی اطاعت و عبادت ہی تحقیق عبودیت کا دوسرا نام ہے۔ پھر قرآن نے ایک قدم اور آگے بڑھا کر حب الٰہی اور حب رسول کا ایک اور نمایاں معیار مقرر فرما دیا ہے، اور وہ ہے جہاد فی سبیل اللہ۔ جہاد کے معنی ہیں اللہ تعالیٰ کے مامورات سے انتہائی شیفتگی اور اس کے منہیات سے مکمل نفرت۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ نے اپنے ان خاص بندوں کا جو اس کے محبوب ہیں اور جن کا وہ محبوب ہے، نشان امتیاز یہ قرار دیا ہے کہ:۔

اَذِلَّةٍ عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ اَعِزَّةٍ عَلَى الْكٰفِرِيْنَ يُجَاهِدُوْنَ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ — وہ مومنوں کے سامنے نہایت فروتن ہوتے ہیں لیکن کافروں کے لیے نہایت سخت۔ اللہ کی راہ میں جہاد کرتے رہتے ہیں۔

یہی وجہ ہے کہ اس اُمت کی محبت اور عبودیت امم سابقہ کے مقابلہ میں زیادہ کامل و اکمل ہے۔ اور اس امت کے اندر اصحاب رسول صلی اللہ علیہ وسلم بہ نسبت اور لوگوں کے زیادہ کامل ہیں، یا پھر وہ لوگ جو اصحاب رسول کا سچا نمونہ بن جائیں۔ جو ان سے جتنی ہی زیادہ عملی ہمرنگی پیدا کرے گا اتنا ہی زیادہ کامل العبودیت ہوگا۔

ایک طرف محبت الٰہی کا یہ معیار اور نمونۂ عمل سامنے رکھیے، پھر ان لوگوں کے اقوال اور کردار پر نظر ڈالیے جو اپنے کو خدا کی محبت کا اور اس کی محبوبیت کا اجارہ دار سمجھتے ہیں، حالانکہ رسول کی سنت اور اس کی اطاعت کی دن رات دھجیاں اُڑاتے رہتے ہیں اور ایسے عقائد و تصورات رکھتے ہیں جو دین و شریعت کی بنیاد ہی ڈھا دیتے ہیں۔

پس اتباع شریعت اور جہاد فی سبیل اللہ ہی وہ سب سے بڑا فرق و امتیاز ہے جو خدا کے سچے عاشقوں اور غلط کار مدعیوں کے درمیان پایا جاتا ہے جس کے ذریعہ ان اولیاء اللہ کے جو واقعتہً خدا کے محب اور محبوب ہیں، اور ان مدعیان محبت کے درمیان تمیز کی جاسکتی ہے جو دعوائے محبت کے ساتھ مخالف شرع امور یعنی اپنی جی کی گھڑی ہوئی بدعات کا اتباع کرتے رہتے ہیں یا محبت کا یہ خود ساختہ مفہوم لیتے ہیں کہ خدا کی پیدا کی ہوئی ہر چیز سے محبت کی جائے حتیٰ کہ کفر و فسق و عصیان جیسی چیزوں سے بھی۔

غور کیجیے تو معلوم ہوگا کہ یہی وہ خطرناک غلط فہمی تھی جس نے یہود اور نصاریٰ کو ڈبو دیا۔ ان نام نہاد صوفیائے اسلام کا دعوائے محبت بھی انھیں اہل کتاب کے اِدّعائے محبت کی طرح کا ہے جو کہا کرتے تھے کہ ہم اللہ کے بیٹے اور اس کے لاڈلے ہیں۔ گو اس لحاظ کہ ان کا کفر ان کے کفر کی حد تک نہیں پہنچا ہے، انھیں یہود و نصاریٰ کے برابر گمراہ نہیں کہا جا سکتا لیکن اگر ایک اور پہلو سے دیکھا جائے تو ان کا دعویٰ ان یہودیوں اور نصرانیوں کے دعوے سے بھی بدتر اور مہلک تر ہے کیونکہ اس کے اندر مخالفت شرع کے ساتھ ساتھ نفاق کے جراثیم بھی موجود ہیں اور معلوم ہے کہ منافقین کا مستقر دوزخ کے سب سے نچلے طبقے میں ہوگا۔

محبت الٰہی کی تعلیم توراۃ اور انجیل میں بھی اسی طرح موجود ہے جس طرح قرآن میں۔ اور ان کتابوں کے الفاظ و عبارات اور اصل تعلیمات کے بارے میں خود ان کے پیروؤں کے درمیان شدید اختلافات ہیں لیکن ان کے باوجود یہ ایک حقیقت ہے کہ محبت الٰہی کی تعلیم کے اصلی ہونے میں کسی گروہ کو اختلاف نہیں۔ بلکہ یہ تعلیم ان کے ہاں "ناموس" کی سب سے بڑی اور بنیادی وصیت تسلیم کی جاتی ہے۔ انجیل میں ہے کہ حضرت عیسیٰ نے فرمایا، مسیح کی سب سے بڑی وصیت یہ ہے کہ "تو خداوند کی محبت کر، اپنے پورے قلب اور اپنی پوری عقل اور اپنی پوری روح کے ساتھ"۔ چنانچہ آج بھی نصاریٰ کو اس امر کا دعویٰ ہے کہ وہ اس حب الٰہی پر قائم ہیں۔ اور ان کے اندر جو زہد اور عبادت پائی جاتی ہے وہ اسی محبت کا اثر ہے۔ لیکن واقعہ کیا ہے؟ واقعہ یہ ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کی محبت سے بالکل تہی دامن ہو چکے ہیں کیونکہ وہ ان چیزوں پر عمل نہیں کرتے جو خدا کو پسند ہیں بلکہ ان چیزوں پر عمل کرتے ہیں جو خدا کو مبغوض ہیں، انھیں رضائے الٰہی کی پروا ہی نہیں، جس کے نتیجہ میں اللہ تعالیٰ نے ان کے سارے اعمال حبط کر دیے ہیں۔ ادھر وہ محبوبیت کے نشہ میں مست، ادھر اللہ تعالیٰ انھیں اپنے باغیوں اور ملعونوں کی فہرست میں شامل کر چکا ہے۔ اور اللہ تعالیٰ کی سنت یہ ہے کہ وہ ان لوگوں کو اپنا محبوب اور مورد لطف و کرم رکھتا ہے جو فی الحقیقت اس کے محب ہوں، پھر یہ کس طرح ممکن ہے کہ بندہ تو خدا سے محبت رکھتا ہو اور خدا کو اس سے کوئی محبت نہ ہو! بلکہ واقعہ یہ ہے کہ خدا سے بندہ کو جتنی محبت ہوتی ہے خدا کو بھی اتنی ہی محبت اس سے ہوتی ہے اور عنایت مزید یہ ہوتی ہے کہ اس کا اجر اس کی بہ نسبت کہیں زیادہ دیتا ہے جیسا کہ حدیث قدسی میں ہے کہ:۔

"جو شخص میری طرف ایک بالشت بڑھتا ہے میں اس کی طرف ایک ہاتھ بڑھتا ہوں اور جو میری طرف ایک ہاتھ قریب آتا ہے میں اس کی طرف ایک گز قریب ہو جاتا ہوں۔ اور جو میری طرف پیدل آتا ہے میں اس کی طرف دوڑ کر آتا ہوں"۔

قرآن کو دیکھیے تو قدم قدم پر یہ الفاظ ملتے ہیں "اللہ متقیوں سے محبت رکھتا ہے"، "اللہ احسان کرنے والوں کو محبوب رکھتا ہے"، "اللہ توبہ کرنے والوں کو پسند کرتا ہے" وغیرہ۔ نہ صرف یہ بلکہ نصوص تو یہ بتاتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ انھیں لوگوں کو اپنی محبوبیت کی سند افتخار عطا فرماتا ہے جو واجبات سے گذر کر نوافل پر کثرت سے عمل کرنے لگتے ہیں۔ مشہور حدیث قدسی ہے:۔

"بندہ نوافل کے ذریعہ میرے قریب ہوتا جاتا ہے یہاں تک کہ وہ میرا محبوب ہو جاتا ہے۔ اس وقت میں ہی اس کے کان بن جاتا ہوں جس سے وہ سنتا ہے، اس کی آنکھ بن جاتا ہوں جس سے وہ دیکھتا ہے...... الخ"

اہل زہد و ریاضت کی خام خیالیاں۔

اللہ تعالیٰ کی محبوبیت اور محبت کا یہ معیار اسلامی نگاہ میں رکھیے اور اس کے بعد ایسے پر خود غلط زہاد کے مزعومات پر نظر ڈالیے جو زہد و عبادت کی چند مخصوص چیزوں پر تندہی کے ساتھ عمل پیرا رہتے ہیں۔ مگر کتنے ہی امور ایسے ہیں

جن میں وہ شریعت کی خلاف ورزی کرتے رہتے ہیں۔ اور اللہ کی راہ میں مجاہدہ کرنے کا تصور تک نہیں رکھتے مگر اس کے باوجود ــــ مخالفتِ شرع اور ترکِ مجاہدے باوجود ــــ خدا کی محبت کے مدعی ہیں۔ اور بعض ویسی ہی خام خیالیوں میں مبتلا ہیں جس میں نصاریٰ مبتلا تھے۔ یہ لوگ اپنے اس محدود تصورِ دین کے اثبات میں اسی قسم کی باتوں سے حجت پیش کرتے ہیں جن کی نصاریٰ نے آڑ لی ہے، یعنی یا تو قرآن و حدیث کے متشابہ الفاظ کی حسبِ خواہش تاویلیں کرتے ہیں، یا پھر ایسے اقوال و حکایات پر اپنے استدلال کی عمارت اٹھاتے ہیں جن کے قائل کی صداقت اور حق پسندی کا ثبوت نہیں اور اگر بر بنائے حسنِ ظن اس کی صداقت شعاری تسلیم ہی کر لی جائے تو بھی اس امرِ واقعہ سے کون انکار کر سکتا ہے کہ وہ معصوم نہ تھا۔ لیکن اس کے باوجود یہ لوگ اس کی باتوں کو وحیِ آسمانی کی طرح واجب الاتباع مانتے ہیں جس کا دوسرے لفظوں میں یہ مطلب ہوا کہ جس طرح نصاریٰ نے اپنے علماء اور مشائخ کو شارعینِ دین کا منصب دے رکھا تھا یہ لوگ بھی اپنے مرشدوں اور پیشواؤں کو در اصل اپنا شارعِ دین سمجھتے ہیں۔ اور انجام کار نوبت یہاں تک بھی پہنچ جاتی ہے کہ عبودیت کی جڑ پر آرہ چلا دیتے ہیں اور یہ دعویٰ کرنے لگتے ہیں کہ خواص، عبدیت کی حدود پار کر جاتے ہیں، جیسا کہ عیسائی حضرت مسیحؑ کے بارے میں دعویٰ کرتے ہیں۔ حالانکہ دینِ حق تو نام ہے اللہ تعالیٰ کی کامل و مکمل عبدیت کی تحقیق کا اور عبدیت کا مدعا عبارت ہے اللہ عزوجل کی انتہائی اور ہمہ گیر محبت سے، ایک کی کسی دوسری شے کی کمی کا ثبوت ہے اور غیر اللہ کی محبت در اصل اس کی عبدیت کا اور غیر اللہ کی عبدیت فی الحقیقت اس کی محبت کا نشان ہے۔ غیر اللہ کی محبت ــــ اگر اللہ ہی کے لیے نہ ہو تو وہ ــــ جبینِ حق کا داغ ہے، اور جس عمل کا ہدف رضائے الٰہی نہ ہو سامانِ حسرت کے سوا کچھ نہیں ہے۔ ایمان کی نگاہ میں یہ دنیا و مافیہا سب کا سب ملعون ہے سوا اس کے جو اللہ ہی کے لیے ہو، اور اللہ کے لیے وہی شے ہو سکتی ہے جو اللہ اور اس کے رسول کو پسند ہو اور اللہ اور رسول اللہ کی پسندیدہ چیز وہی ہے جس کی رسول نے اپنے اقوال و افعال کے ذریعہ تعلیم دی ہے۔ پس جو عمل خدا کے لیے نہ ہو وہ بھی مردود (انما الاعمال بالنیات الخ) اور جو عمل اسوۂ رسول کے مطابق نہ ہو وہ بھی مردود (من عمل عملا لیس علیہ امرنا فھو رد)۔

یہی دینِ اسلام کی بنیاد ہے، یہ بنیاد جتنی محکم اور استوار ہوگی اتنی ہی دین کی حقیقت کا وجود ہوگا۔ یہی مقصد تھا آسمانی کتابوں کے نزول کا اور یہی غایت تھی انبیاء کرام کی بعثت کی۔ اسی کا آخری داعیِ اسلام نے بھی پیغام سنایا، اسی کے لیے اس نے اپنے جسم و روح کی ساری قوتیں وقف کر رکھی تھیں۔

آفاتِ نفس (شرک) اس مقام عبدیت تک پہنچنے میں نفسِ انسانی کی بعض زبردست کمزوریاں روک بن جاتی ہیں، ان میں سے سب سے بڑی اور بنیادی شے میلانِ شرک ہے۔ شرک نفسِ انسانی کی ایک غالب اور قاہر بیماری ہے، یہاں تک کہ اس امت میں بھی اس کے مخفی جراثیم پائے جاتے ہیں جو توحید کی تنہا علمبردار ہے اور اس کی خبر خود نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے دی ہے۔ چنانچہ صحابہ کرام اس سے محفوظ رہنے کی فکر سے کبھی غافل نہیں رہتے تھے۔ حضرت صدیق اکبر نے پیغمبر صلعم سے پوچھا کہ "جب شرک پائے مور کی آہٹ سے بھی زیادہ مخفی ہوتا ہے (جیسا کہ حضور فرماتے ہیں) تو بھلا ہم اس کے حملے سے کیونکر بچ سکتے ہیں؟" ارشاد ہوا کہ "آؤ میں ایک ایسا کلمۂ شفا بتا دوں جو تمہیں ہر چھوٹے بڑے شرک سے محفوظ رکھے گا، تم خدا سے دعا کیا کرو کہ:-

اللھم انی اعوذ بک ان اشرک بک وانا اعلم واستغفرک لما لا اعلم۔	خدایا! میں اس بات سے تیری پناہ مانگتا ہوں کہ جان بوجھ کر تیرا ساجھی ٹھیراؤں اور اس شرک سے تیری مغفرت چاہتا ہوں جس کا مجھے علم نہ ہو۔"

حضرت عمرؓ دعا مانگا کرتے تھے کہ :۔

اللھم اجعل عملی کلہ صالحاً واجعلہ لوجھک خالصاً ولا تجعل لاحد فیہ شیئاً۔ — اے اللہ میرے ہر عمل کو صالح اور اپنے ہی لیے خالص بنا اور اس میں کسی اور کا کوئی حصہ نہ بنا۔

حبِ جاہ و مال

نفسیات کا مطالعہ بتاتا ہے کہ گو نفسِ انسانی پر ایسی مخفی آرزوئیں چھائی رہتی ہیں جو خدا کی حقیقی محبت، بندگی اور اخلاص کے پودے کو پروان چڑھنے نہیں دیتیں۔ شداد بن اوسؓ نے اہلِ عرب کو مخاطب کرکے فرمایا کہ "اے اہلِ عرب! مجھے تمہارے بارے میں سب سے زیادہ جس چیز کا خوف ہے وہ ریا اور شہوتِ خفیہ (یعنی جاہ و حشمت کی خواہش) ہے۔ خود نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس عظیم ترین مہلکہ ایمانی سے ان لفظوں میں تنبیہ کیا ہے :۔

"دو ایسے بھوکے بھیڑیے، جو بکریوں کے کسی باڑے میں چھوڑ دیے جائیں، ان بکریوں کے لیے اتنے خطرناک نہیں جتنی مال اور جاہ کی حرص، دین و ایمان کے لیے خطرناک ہے۔" (ترمذی)

معلوم ہوا کہ جس سینہ میں سچا اور صحیح دین ہوگا اس میں حرص مال و جاہ کا وجود ممکن نہیں۔ جس کا سبب یہ ہے کہ جب دل محبت اور عبودیتِ الٰہی کا مزا پا لیتا ہے تو پھر اس کی نگاہ میں کوئی شے اس سے بڑھ کر مرغوب نہیں رہ جاتی کہ وہ اس کی طرف مائل ہو سکے۔ یہی وہ چیز ہے جو اہلِ اخلاص کے لیے برائیوں اور بدکاریوں سے محفوظ رہنے کا ذریعہ بنتی ہے، جیسا کہ قرآن کریم سے مترشح ہوتا ہے :۔

كَذٰلِكَ لِنَصْرِفَ عَنْهُ السُّوْٓءَ وَالْفَحْشَآءَ اِنَّهٗ مِنْ عِبَادِنَا الْمُخْلَصِيْنَ۔ — اسی طرح، تاکہ ہم یوسف سے برائی اور بے حیائی کو دور رکھیں۔ یقیناً وہ ہمارے مخلص بندوں میں سے تھا۔

اس کی وجہ یہ ہے کہ بندہ مخلص محبتِ الٰہی اور خدا پرستی کا وہ ذوق رکھتا ہے جو اس کو غیر خدا کی محبت اور بندگی سے روک دیتا ہے کیونکہ اس کے دل کے لیے کوئی شے ایمان سے زیادہ شیریں، لذیذ، خوش آیند اور پرکشش نہیں رہ جاتی اور یہ کیفیتِ باطن تقاضا کرتی ہے کہ قلب اللہ تعالیٰ کی طرف کھنچ اٹھے اور پھر ہمہ دم اسی کی طرف جھکا رہے، اسی کے ذکر میں مشغول، اسی کے خوف سے لرزاں اور اسی کی نوازشوں کا امیدوار رہے، جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا :۔

مَنْ خَشِيَ الرَّحْمٰنَ بِالْغَيْبِ وَجَآءَ بِقَلْبٍ مُّنِيْبٍ ...... الخ — جو غیب میں خدائے رحمٰن سے ڈرتا رہا اور اس کے حضور رجوع و انابت سے بھرا ہوا دل لے کر حاضر ہوا...... الخ۔

یہ اس لیے کہ محبت کا فطری اقتضا ہی یہ ہے کہ محب اگر ایک طرف وصالِ محبوب کی امیدوں سے سرشار ہوتا ہے تو ساتھ ہی حصولِ مراد کی ناکامیوں کے تصور سے مضطرب بھی رہتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ خدا کا بندہ اور اس کا محب ہمیشہ خوف اور رجاء کے مشترکہ انفعالی جذبات محسوس کرتا ہے۔ يَرْجُوْنَ رَحْمَتَهٗ وَيَخَافُوْنَ عَذَابَهٗ کے الفاظ اسی حقیقت کے آئینہ دار ہیں۔

اس کے بالمقابل اس شخص کو لو جو اس دولتِ اخلاص سے بے بہرہ ہے۔ طلب و ارادہ اور محبتِ مطلق تو بہرحال اس کے دل میں بھی ہوگی کہ طلب و محبت انسانی فطرت کے لوازم میں سے ہے۔ لیکن جس طرح ایک کمزور شاخ ہوا کے ہر اشارے پر جھک جانے کے لیے تیار ہو جاتی ہے، بعینہٖ اسی طرح ایسا آدمی بھی نورِ اخلاص سے محرومی کے باعث کسی بھی دروازے پر جھک سکتا ہے اور اپنے اس جذبۂ محبت کو جس آستانہ پر چاہے بھینٹ چڑھا دیتا ہے۔ کبھی حسین صورت پر ریجھتا ہے تو ایسے ایسے پست اور ذلیل افسانوں

کا غلام بن کر رہ جاتا ہے جو عام حالات میں خود اس کی غلامی کی بھی اہلیت نہیں رکھتے۔ اور کبھی شوقِ نمود اور تمنائے ریاست کا دیوانہ بن جاتا ہے تو ذرا سی بات پر مگن ہو جاتا ہے اور معمولی سی بات پر آپے سے باہر۔ خوشامدیوں کا غلام بن جاتا ہے، اگرچہ وہ اس کی کتنی ہی جھوٹی تعریف کریں، اور ملامت گروں کے خون کا پیاسا ہو جاتا ہے، اگرچہ ان کی ملامت کتنی ہی مبنی بر صداقت کیوں نہ ہو۔ اور کبھی مال و دولت کا طوقِ عبدیت اپنی گردن میں ڈال لیتا ہے۔ غرضیکہ جو دل فریب چیز بھی سامنے آگئی اس نے اپنے آپ کو اس کے حوالے کر دیا۔ انجام کار، اس کی خواہشِ نفس ہی اس کا معبود ہو جاتی ہے، پھر زندگی کا جو قدم بھی وہ اٹھاتا ہے ہدایتِ الٰہی سے بے نیاز ہو کر ہی اٹھاتا ہے۔

نفسِ انسانی کی یہی دو حالتیں ہو سکتی ہیں۔ یا تو وہ اللہ واحد کا مخلص پرستار رہے یا پھر مخلوقات کا بندہ ہو کر رہے اور مختلف قسم کے شیاطین اس کے دل و دماغ پر چھا جائیں۔ تیسری کوئی راہ نہیں ہے۔ کیونکہ قلبِ انسانی اگر ماسوا سے کٹ کر اللہ واحد کا گرویدہ نہیں ہے تو شرک کی نجاستوں سے اس کا آلودہ ہونا ایک امرِ یقینی ہے۔ قرآن مجید جب ایمان کا مطالبہ کرتا ہے اس کی حقیقت اس سے ذرا بھی مختلف یا کم نہیں ہے۔ فرماتا ہے:-

فَأَقِمْ وَجْهَكَ لِلدِّينِ حَنِيفًا ...... ذٰلِكَ الدِّينُ الْقَيِّمُ وَلٰكِنَّ أَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَعْلَمُونَ مُنِيبِينَ إِلَيْهِ وَاتَّقُوهُ وَأَقِيمُوا الصَّلٰوةَ وَلَا تَكُونُوا مِنَ الْمُشْرِكِينَ۔

پس تو اپنے رخ کو، یکسو ہو کر، دینِ اسلام کی طرف سیدھا کر، ...... یہی فطری دین ہے لیکن اکثر لوگ نہیں جانتے۔ اس کی طرف جھکتے ہوئے، اور اس سے ڈرو اور نماز قائم کرو اور مشرکوں میں سے نہ ہو۔

تمام بنی نوعِ انسان انہی دو گروہوں میں منقسم ہیں۔ ایک تو حنیف و مخلص بندوں کا گروہ جو خدا ہی کی محبت اور عبودیت اور مخلصانہ طاعت کا علمبردار ہے۔ دوسرا مشرکین کا گروہ جو ہوائے نفس کا پرستار ہے۔ اللہ تعالیٰ نے ابراہیم اور آلِ ابراہیم کو پہلے گروہ کا امام قرار دیا ہے، جس طرح اس نے فرعون اور آلِ فرعون کو دوسرے گروہ کا پیشوا قرار دیا ہے:-

وَوَهَبْنَا لَهُ إِسْحٰقَ وَيَعْقُوبَ نَافِلَةً وَكُلًّا جَعَلْنَا صٰلِحِينَ وَجَعَلْنَاهُمْ أَئِمَّةً يَهْدُونَ بِأَمْرِنَا ...... الخ

اور ہم نے ابراہیم کو بخشے اسحاق اور یعقوب بطورِ عطیہ اور ان میں سے ہر ایک کو ہم نے صالح بنایا اور ہم نے ان کو امام بنایا جو ہمارے حکم کے مطابق لوگوں کی رہنمائی کرتے تھے۔

فرعون اور آلِ فرعون کے متعلق فرمایا:-

وَجَعَلْنَاهُمْ أَئِمَّةً يَدْعُونَ إِلَى النَّارِ ... الآیہ

اور ہم نے ان کو گمراہی کا لیڈر بنایا جو لوگوں کو آگ کی طرف بلاتے تھے۔

فتنۂ وحدۃ الوجود اس گروہ فرعونی کی ضلالت کی ابتدا، اس غلط نظریہ سے ہوتی ہے کہ اللہ تعالیٰ کی رضا اور قضا، مرضی اور مشیت دونوں ایک چیز ہیں، اور انتہا اس کفرِ خالص پر ہوتی ہے کہ خالق اور مخلوق دونوں ایک ہی شے ہیں۔ جو خالق ہے وہی مخلوق ہے اور جو مخلوق ہے وہی خالق ہے۔ ان کو یہ اصرار ہے کہ مخلوق بھی خالق کی ہم پلہ ہے حالانکہ ابراہیمؑ کا اعلان یہ ہے کہ "تم اور تمہارے گمراہ آباء و اجداد نے جن چیزوں کو معبود بنا رکھا ہے وہ سب کے سب، ماسوا پروردگارِ عالم کے، میرے دشمن ہیں" أَفَرَأَيْتُم مَّا كُنتُمْ تَعْبُدُونَ أَنتُمْ وَآبَاؤُكُمُ الْأَقْدَمُونَ فَإِنَّهُمْ عَدُوٌّ لِّي إِلَّا رَبَّ الْعَالَمِينَ۔

جیسا کہ ہم پہلے بتا چکے ہیں، ان لوگوں کے مسلک کی بنیاد بعض مشائخ کے متشابہ اقوال پر ہے، یہ غریب دبتحار تاویل اور زیغ قلب وفکر کی اسی بیماری میں مبتلا ہوگئے جس کے شکار نصاریٰ ہوگئے تھے۔

فنا ان متشابہ اقوال میں سے مثال کے طور پر ایک مشہور عام لفظ فنا کا لے لو اور دیکھو کہ اس ایک لفظ کے پردہ میں کیسے کیسے خطرناک اور سراپا الحاد فتنے چھپے ہوئے ہیں۔

فنا کے تین درجے ہیں، ایک درجہ تو وہ ہے جو انبیائے کرام اور اولیائے کاملین کو حاصل تھا، دوسرا درجہ عام صلحائے امت اور کم مرتبہ اولیاء کا ہے۔ تیسرا درجہ منافقوں اور ملحدوں کا حصہ ہے۔

پہلے درجہ کی حقیقت یہ ہے کہ عابد کی نگاہ میں اللہ کے سوا ہر شے بے حقیقت ہو کر رہ جائے، خدا ہی سے محبت ہو، اسی کی بندگی ہو، اسی پر بھروسہ ہو اور اسی سے ہر طرح کی مدد چاہی جائے۔ بندگی کا کمال یہ ہے کہ بندہ وہی پسند کرے جو خدا کو پسند ہو اور اسی چیز سے محبت رکھے جو خدا کو محبوب ہے۔ مثلاً ملائکہ، انبیاء اور صلحاء۔ جس دل پر یہ حالت طاری ہو جائے اس کو قرآن نے "قلب سلیم" کہا ہے۔ سلیم کے معنی ہیں محفوظ، قلب سلیم وہ قلب ہے جو ماسوائے اللہ سے یا ماسوائے عبادت الٰہی سے یا ماسوائے مراد الٰہی سے یا ماسوائے محبت الٰہی سے پاک اور محفوظ ہو۔ خدا کی محبت اور بندگی کے اس مقام کو آپ فنا کے لفظ سے تعبیر کریں یا کسی اور لفظ سے، ہمیں اس سے چنداں بحث نہیں ہے، البتہ یہ حقیقت ہے کہ اصلی اسلام یہی ہے۔

دوسری قسم فنا کی یہ ہے کہ ماسوا کے شہود سے قلب یکسر بے نیاز ہو جائے۔ اکثر سالک اسی کیفیت میں رہتے ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ان کے دل خدا کی محبت، عبادت اور اس کے ذکر کی طرف پوری طرح کھنچ اٹھتے ہیں اور چونکہ دل کمزور ہوتے ہیں اس وجہ سے مشاہدہ جلال وجمال خداوندی سے ایسے مرعوب ومتحیر ہو جاتے ہیں کہ ان میں اتنی قوت باقی نہیں رہ جاتی کہ ماسوا کو دیکھ سکیں جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ غیر اللہ کا ان کے دلوں میں سرے سے گذر ہی نہیں ہوتا بلکہ وہ اس کا احساس تک کھو بیٹھتے ہیں۔ یہی کیفیت قلبی تھی ام موسیٰ کی جب حضرت موسیٰ کو موجوں کے دوش پر بحکم الٰہی سوار کرایا گیا اور جس کے متعلق قرآن نے فرمایا ہے کہ:۔

وَأَصْبَحَ فُؤَادُ أُمِّ مُوسَىٰ فَارِغًا . . . . الآیہ۔ موسیٰ کی ماں کا دل "خالی" ہوگیا۔

"خالی ہوگیا" یعنی موسیٰ کے ذکر وفکر کے سوا ہر شے سے خالی ہوگیا۔ اس میں صرف موسیٰ ہی موسیٰ رہ گئے۔ یہ کیفیت ایسے اشخاص پر بالعموم طاری ہو جایا کرتی ہے جن کو محبت یا خوف یا رجا کے کسی غیر معمولی جذبہ سے یکایک سامنا ہو جاتا ہے اس وقت ان کے دل میں اس شے کے سوا جس سے محبت یا خوف یا رجا کا جذبہ وابستہ ہے کسی اور چیز کا تصور نہیں رہ پاتا۔ پس ذکر الٰہی میں بھی اس صورت حال کا پیش آنا ایک امر واقعہ ہے، اور جب کسی ذاکر کو یہ مرحلہ پیش آجاتا ہے اس وقت من وتو کی تمیز اٹھ جاتی ہے، وہ اپنے محبوب کو پاکر خود اپنے وجود سے غافل ہو جاتا ہے اور اپنے مشہود میں محو ہو کر اپنے آپ کو بھی فراموش کر بیٹھتا ہے، اس کی نگاہ باطن صرف ایک ذات ازلی وحقیقی یعنی اللہ تعالیٰ ہی کو موجود باقی ہے اور باقی ساری کائنات اس کے لیے فنا ہو جاتی ہے۔ جب یہ کیفیت شدت وقوت اختیار کر لیتی ہے اور ساتھ ہی سالک کا دل اتنا کمزور بھی ہوتا ہے کہ من وتو کے امتیاز میں حیران سا رہ جاتا ہے تو اس کے ذہن پر یہ گمان مستولی ہو جاتا ہے کہ وہی آپ اپنا محبوب ہے۔

یہ وہ مقام ہے جس کی تمیز اور معرفت میں کتنی ہی قوموں نے ٹھوکریں کھا کر اپنے آپ کو گمراہی کے گڑھے میں ڈال دیا

انھوں نے اس کیفیت کو "اتحاد" سمجھ لیا یعنی یہ کہ یہ وہ مقام ہے جہاں عاشق اپنے محبوب میں جا ملتا ہے اور پھر ان دونوں کے وجود میں کوئی فرق، کوئی غیریت اور کوئی دوئی نہیں رہ جاتی بلکہ دونوں مل کر ایک وجود ہو جاتے ہیں۔ لیکن یہ صریح غلطی اور نادانی ہے کیونکہ خالق کے ساتھ کوئی چیز بھی متحد نہیں ہو سکتی اور خالق کیا، کوئی چیز بھی کسی دوسری چیز کے ساتھ متحد نہیں ہو سکتی سوائے اس کے کہ وہ دونوں اپنی ماہیت سے دست کش ہو جائیں یا ان میں فساد رونما ہو جائے یا ان دونوں کے ملنے سے ایک تیسری شے پیدا ہو جائے جو ان دونوں میں سے ہر ایک سے مباین حقیقت رکھتی ہو، جس طرح پانی اور دودھ یا پانی اور شراب مل کر ایک تیسری شے بن جاتے ہیں کہ پھر نہ اسے پانی کہہ سکتے ہیں نہ دودھ نہ شراب۔ اور ظاہر ہے کہ ذاتِ باری کے متعلق ان میں سے کسی صورتِ اتحاد کا تصور نہیں کیا جا سکتا۔ اس لیے عاشق خدا اور خدا کا متحد ہونا ایک امر ناممکن ہے۔ ان دونوں کی مراد اور مرضی میں اتحاد ہو سکتا ہے ان کی پسند اور ناپسند میں یکسانی ہو سکتی ہے کہ جو چیز محبوب کو بھلی معلوم ہو اس کو بھی بھلی لگے اور جس چیز سے محبوب کو نفرت ہو اس کو بھی نفرت ہو، جس کو محبوب دوست رکھتا ہو اس کو وہ بھی دوست رکھے اور جس کو محبوب دشمن سمجھتا ہو اس کو وہ بھی دشمن سمجھے۔ یہی اتحاد ممکن ہے اور واقعہ یہ ہے کہ یہی اور صرف یہی اتحاد ہوتا بھی ہے۔

فنا کی یہ نوعیت اپنے اندر گوناگوں نقائص رکھتی ہے اور اولیائے کاملین مثلاً حضرت ابوبکرؓ و عمرؓ اور دیگر اکابر مہاجرین و انصار سابقین میں سے کوئی بھی اس میں نہیں پڑا، اور انبیائے کرام کا تو ذکر ہی کیا۔ فنا کی یہ قسم صحابہ کے بعد عالم وجود میں آئی، کیونکہ اس فنا کا مولد و منشا، دراصل ضعفِ قلب ہے اور صحابہ کے قلوب وارداتِ ایمانی کا تحمل کرنے میں اتنے کامل، اتنے قوی اور اتنے ثابت و ضابط تھے کہ کسی حال میں بھی ان کی عقلیں معطل نہ ہوتی تھیں، نہ ان پر کوئی ضعف طاری ہوتا تھا نہ کوئی سکر، نہ کبھی ان پر غشی کی حیرانی طاری ہوتی تھی، نہ وجد و حال کی وارفتگی۔ ان باتوں کی ابتدا، تو بصرہ کے تابعین سے ہوئی ہے۔ سب سے پہلے وہیں یہ بات دیکھنے میں آئی کہ بعض لوگوں نے قرآن سنا اور اس کے جلال کی تاب نہ لا کر بے ہوش ہو گئے۔ اور بعض کی اسی عالم میں روح ہی پرواز کر گئی۔ مثلاً ابوجہیر اور زرارہ بن اوفی قاضی شہر۔ پھر یہ سلسلہ آگے چلا اور شیوخ صوفیہ میں سے بھی ایسے لوگ گذرے جن پر فنا اور سکر کی ایسی کیفیت طاری ہوئی جس نے ان کی قوتِ تمیز کو ناکارہ کر دیا۔ یہاں تک کہ وہ اسی عالم مدہوشی میں ایسی باتیں کہہ گئے جن کی غلطی کا، درستگی حواس کے بعد، انھوں نے خود اعتراف کیا۔ جیسا کہ حضرت ابویزیدؒ، ابوالحسنؒ اور ابوبکر شبلیؒ وغیرہ بزرگوں کی بابت بیان کیا جاتا ہے۔ ان کے برخلاف حضرت ابوسلمان دارانی، معروف کرخی فضیل بن عیاض اور حضرت جنید وغیرہ جن کے قلوب مضبوط تھے اور جن کے قوائے عقل و تمیز ہر حال میں بحال رہتے تھے کبھی اس کیفیت میں مبتلا نہ ہوئے۔ محبت و بندگی کا حقیقی کمال یہی ہے۔ جو لوگ اس نعمتِ کمال سے بہرہ ور ہوتے ہیں ان کی فضائے عقل میں خدا کی محبت، عبادت اور طلب کے سوا کسی غیر شے کا گذر نہیں ہوتا۔ مگر اس کے ساتھ ہی وہ علم اور وہ قوتِ تمیز ان کے ساتھ رہتی ہے جو انھیں تمام امور اور اشیاء کا ان کی اصل صورت میں مشاہدہ کراتی رہتی ہے۔ وہ اپنی بصیرت کی نگاہوں سے دیکھتے ہیں کہ تمام کائنات اللہ تعالیٰ ہی کے امر و حکم سے قائم ہے اور اسی کی مشیت ان سب کی مدبر ہے، پھر اس سے بھی آگے بڑھ کر ان کے سامنے یہ راز فطرت بے نقاب ہو جاتا ہے کہ ساری کائنات اللہ جل مجدہ کے سامنے سربسجدہ اور اس کی تسبیح میں مشغول ہے۔ یہ مشاہدہ ان کے لیے بڑی عبرت و موعظت کا سبب بن جاتا ہے اور ان کے اخلاصِ دینی، عبادتِ الٰہی اور خالص خدا پرستی کے جذبات کے لیے مہمیز کا کام کرتا ہے۔

قرآن جس حقیقتِ عبودیت کی طرف بلاتا ہے وہ یہی ہے۔ سچے مومنوں اور کامل عارفوں نے، جن کے سرتاج ہمارے پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم ہیں، اسی عبودیت کو اختیار کیا۔ چنانچہ جب شبِ معراج میں آپ آسمانوں پر تشریف لے گئے اور وہاں آیاتِ الٰہی کا آپ نے نظارہ فرمایا اور پھر عبد ومعبود میں ناقابلِ فہم وبیان راز ونیاز ہوئے، تو باوجودیکہ یہ قربِ الٰہی کا وہ مقام تھا جو کسی کو بھی نصیب نہ ہوا مگر آپ کی حالت میں کوئی تغیر واقع نہیں ہوا۔ نہ کسی قسم کی خود فراموشی طاری ہوئی اور نہ آپ کی عقل وتمیز معطل ہوئی۔ بخلاف موسیٰ علیہ السلام کے کہ طور پر تجلیٔ رب کا عکس دیکھنے کی بھی تاب نہ لا سکے اور بے ہوش ہو گئے۔

فنا کی تیسری قسم یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کے سوا اور کوئی معبود دکھائی نہ پڑے اور خالق کا وجود ہی عین مخلوقات کا وجود قرار پا جائے گویا عبد اور معبود میں کوئی فرق نہ رہ جائے۔ فنا کی یہ تعریف ان گمراہوں اور ملحدوں کے نزدیک ہے جو حلول اور اتحاد کے قعرِ ضلالت میں جا گرے۔

کلامِ مشائخ کی صحیح تاویل

اہلِ حق ومعرفت شیوخ نے جو اس قسم کے جملے کہے ہیں کہ "ما اریٰ غیر اللہ" یا "لا انظر الیٰ غیر اللہ" وغیر ذٰلک تو ان کی مراد ان اقوال سے یہ ہے کہ "میں اللہ کے سوا کسی کو کائنات کا پروردگار یا خالق یا مدبر یا الٰہ نہیں دیکھتا" اور "میں کسی غیر کی طرف محبت یا خوف یا امید کی نگاہیں نہیں ڈالتا"۔ کیونکہ انسان کی نگاہ اسی چیز کی طرف اٹھتی ہے جو اس کے دل میں کوئی جگہ رکھتی ہو جس سے اسکو کوئی محبت یا خوف ہو، ورنہ جس چیز سے نہ اس کو کوئی محبت ہو، نہ کوئی عداوت، نہ کوئی طمع ہو نہ کوئی خوف، اس کی طرف اس کا دل کبھی متوجہ نہ ہوگا اور اگر کبھی اس کی نگاہ اس پر اتفاقاً پڑے گی بھی تو بالکل اسی طرح جیسے راہ چلتے کسی اینٹ پتھر پر پڑ جایا کرتی ہے۔ پس یہ ایک حقیقت ہے اور نہایت قابلِ ستائش حقیقت ہے کہ بزرگانِ دین مخلوقات پر اسی حیثیت سے نظر ڈالتے تھے اور ان کے اقوالِ مذکورہ کا یہی مدعا ہے۔ وہ ان جملوں میں توحید اور اخلاص کی اس کامل اور بے آمیز حقیقت کا اعلان فرماتے ہیں کہ بندہ کو غیر اللہ کی طرف التفات نہ کرنا چاہیے۔ اور نہ کسی ماسوا کی طرف محبت یا خوف یا رجا کی آنکھ اٹھانی چاہیے، بلکہ اس کے دل کو تمام مخلوق کے ذکر وفکر سے خالی اور بے نیاز ہونا چاہیے اور جب بھی ان کی طرف دیکھے اللہ کے نور کے ساتھ دیکھے۔ یعنی حق کے کانوں سے سنے، حق کی نظروں سے دیکھے، حق کے ہاتھوں سے پکڑے، حق کے پاؤں سے چلے، اس کائنات کی انہی چیزوں سے محبت رکھے جن سے خدا کو محبت ہو، اور ان سے نفرت کرے جن سے خدا کو نفرت ہو۔ اس دنیا کو برتنے میں اللہ سے ڈرتا رہے اور اللہ کی رضا کے معاملہ میں ساری مخلوق کی مخالفتوں اور عداوتوں سے بے خطر ہو۔ یہی وہ دل ہے جو سلیم اور حنیف ہے، جس کو عارف وموحد کہا گیا ہے اور جس کو مومن ومسلم کا خطاب زیب دیتا ہے۔ جس طرح فنا کی تیسری قسم یعنی فنا فی الوجود فرعون اور اس کے اتباع مثلاً قرامطہ وغیرہ کی تحقیق ہے اسی طرح کی پہلی قسم انبیائے کرام اور ان کے اتباع صالحین کے مخصوصات میں سے ہے۔ اور یہی اس بات کی دلیل ہے کہ یہ اللہ تعالیٰ کے نزدیک محمود ہے۔ جتنے سچے اور قابلِ اتباع مشائخ گذرے ہیں سب کا اللہ رب السموات والارض کے متعلق یہی تصور اور اعتقاد تھا کہ وہ ساری مخلوق سے بالکل الگ اور جداگانہ ہستی ہے۔ وہ قدیم ہے اور باقی ساری موجودات حادث ہیں اور اس ذاتِ قدیم کا تمام اشیائے حادث سے الگ اور منفرد ہونا ایک امرِ ضروری ہے۔ انھوں نے راہِ سلوک میں پیش آنے والے امراض وشبہاتِ قلب سے بھی پوری طرح باخبر کر دیا ہے کہ بعض لوگ سلوکِ باطن کے دوران میں

مشاہدہ تو مخلوقات کا کرتے ہیں لیکن قلب میں قوتِ تمیز کے فقدان کے باعث انھیں کو خالق گمان کر بیٹھتے ہیں۔ بالکل اسی طرح ایک آدمی سورج کی شعاعوں کو دیکھ کر یہ گمان کر بیٹھے کہ یہی سورج ہیں۔ حالانکہ حقیقت یہ نہیں ہوتی۔

وحدۃ الشہود فنا کی اصطلاح سے ملتی جلتی "فرق اور جمع" کی اصطلاحیں بھی ہیں اور ان میں بھی اسی قسم کے خطرناک رسوم عبادت اور تصورات داخل ہو گئے ہیں جو فنا کی اصطلاح میں موجود ہیں۔ ایک بندہ جب مخلوقات کی گوناگونی اور کثرت پر نگاہ ڈالتا ہے تو اس کی نگاہ اور اس کا قلب دونوں ہی ان میں الجھ کر رہ جاتے ہیں، وہ مختلف چیزوں کو سامنے پاتا ہے اس لیے مختلف سمتوں میں اس کی نظریں اٹکی رہتی ہیں۔ کہیں شوق و محبت کی بنا پر، کہیں خوف کی بنا پر اور کہیں امید کی بنا پر۔ پھر قلب و نظر کے اضطراب اور تفرق کے بعد جب اس کو "جمع" کا منبع اطمینان ہاتھ آجاتا ہے تو اس کی آوارگی نظر جمعیت سے بدل جاتی ہے اور اس کا دل خدا کی وحدانیت اور عبودیت پر آکر جم جاتا ہے۔ اس وقت اس کی محبت، استعانت، خوف، رجا اور توکل کے سارے احساسات اسی ایک ذاتِ والاصفات پر آکر مرتکز ہو جاتے ہیں۔ ایسی حالتِ استغراق میں بسا اوقات ایسا بھی ہوتا ہے کہ اس کے قلب کو اتنی فرصت نہیں ملتی کہ وہ مخلوقات کی طرف بھی دیکھ سکے تاکہ خالق اور مخلوق میں امتیاز کرے، اور کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ قلب مرکزِ حق پر معتکف ہو جاتا ہے اور خلق سے بالقصد توجہ پھیر لیتا ہے۔ یہ فنا کی قسم ثانی سے بالکل مشابہ کیفیت ہے اور ضعفِ قلب کا نتیجہ ہے۔

اس کے بعد "جمع" کی ایک دوسری قسم آتی ہے۔ وہ یہ کہ ذاتِ باری تعالیٰ پر دل سے یکسوئی کے ساتھ جم جانے کے باوجود اس کو یہ دکھائی دیتا ہو کہ تمام کائنات اللہ ہی کی قدرت سے قائم اور اسی کے حکم و تدبیر سے مصروفِ عمل ہے، اور یہ کہ مخلوقات کی ساری کثرت اور گوناگونی، اللہ تعالیٰ کی وحدانیت میں گم اور معدوم ہے، اور یہ کہ اللہ ہی ساری مخلوق کا پروردگار، معبود، خالق اور مالک ہے۔ ایسا دل ایک طرف تو اخلاص و محبت، خوف و رجاء، توکل و استعانت، حب للہ اور بغض للہ کے جذباتِ ملکوتی سے لبریز اور ذاتِ خداوندی پر مجتمع رہتا ہے اور دوسری طرف خالق اور مخلوق کا فرق و امتیاز بھی اس کی نگاہ سے اوجھل نہیں ہونے پاتا۔ یہی حقیقی شہود ہے، یہی سچی عبدیت ہے اور یہی کلمہ طیبہ کی صحیح روح ہے۔ لا الٰہ الا اللہ کی شہادت کا عملی مفہوم اس کے سوا کچھ ہے ہی نہیں۔ کیونکہ یہ چیز قلب میں غیر اللہ کی معبودیت کا کوئی دھندلا سا نشان بھی نہیں چھوڑتی اور حق تعالیٰ کی الٰہیت کا عمیق اور ہمہ گیر نقش اس پر بٹھا دیتی ہے، گویا ہر ایک مخلوق کی معبودیت کی نفی اللہ رب العالمین کی معبودیت کا کامل اور لازوال اثبات کر دیتی ہے۔ جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ دل اسی ایک ذات پر آکر مجتمع ہو جاتا ہے اور غیر اللہ کے اضطراب انگیز تعلقات سے بالکل کنارہ کش ہو کر رہ جاتا ہے۔ پھر اس کی تمام تر توجہات کا مرکز اللہ ہی رہتا ہے اور اس کے ذکر و فکر، عشق و محبت، تعظیم و عبادت، طلبِ رضا و اطاعتِ امر اور خوف و رجا کے جذبات اسی ایک کعبۂ مقصود کے طواف میں مشغول رہتے ہیں، لیکن ساتھ ہی وہ ایک لمحے کے لیے بھی اس حقیقت کو فراموش نہیں کرتا کہ مخلوقات عالمِ واقعہ میں اپنا الگ اور مستقل وجود رکھتی ہیں، ایسا وجود جو وجودِ باری تعالیٰ سے یکسر مباین ہے۔

اس مقام تک پہنچ جانے کے بعد وہ صحیح معنوں میں موحد بن جاتا ہے۔ چنانچہ اس رازِ توحید کی طرف ان احادیث سے کھلی ہوئی رہنمائی ہوتی ہے جن میں فرمایا گیا ہے کہ "سب سے افضل ذکر لا الٰہ الا اللہ ہے"۔

ذکر الٰہی کے بدعی اور غیر مشروع طریقے

بدقسمتی سے لوگوں نے یہاں بھی کجی ذہن کے نہایت خطرناک مظاہرے کیے ہیں اور اتنے واضح ارشاد کے باوجود یہ گمان کر بیٹھے کہ لا الٰہ الا اللہ کا ذکر محض عوام کے لیے ہے، اور خواص کا طریقۂ ذکر یہ ہے کہ صرف لفظ "اللہ" کا ورد کیا جائے اور خاص الخواص کو اس لفظ کے اظہار کی بھی ضرورت نہیں، ان کے لیے "یاہو" کا ذکر کافی ہے۔ لیکن یہ کھلی ہوئی غلطی اور گمراہی ہے، اور ان کے اپنے ان دعاوی پر آیات قرآنی سے استدلال تو تحریف اور غلط بیانی کا شاہکار ہے۔ مثال کے طور پر ان کے بعض استدلالات کو لیجیے۔ آیت قُلِ اللّٰهُ ثُمَّ ذَرْهُمْ فِي خَوْضِهِمْ يَلْعَبُونَ۔ سے استدلال کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ دیکھو یہاں اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے کہ کہو "اللہ" معلوم ہوا کہ صرف "اللہ" "اللہ" کہنا ہی ذکر میں کافی ہے۔ لیکن ایک معمولی عقل و فہم کا آدمی بھی، جس کو قرآنی تعلیمات اور عربی اسالیب سے ذرا بھی مس ہو، سیاق کلام کو سامنے رکھ کر بادنیٰ تامل محسوس کر سکتا ہے کہ لفظ اللہ یہاں تنہا نہیں ہے بلکہ ایک پورے جملے کا ایک ٹکڑا ہے جس کو سیاق عبارت اور قرینۂ مقالی کی بنا پر حذف کر دیا گیا ہے۔ کیونکہ استفہام کے جواب بالعموم اسی طرح دیے جاتے ہیں کہ جملۂ سوالیہ کے بیشتر الفاظ، جن کو جواب میں دہرانا ہو، حذف کر دیے جاتے ہیں۔ اس جملہ کو اگر ظاہر کر دیا جائے تو یوں ہوگا کہ قل اللہ الذی انزل الکتاب الذی جاء بہ موسیٰ۔ کیونکہ یہ قول ان یہودیوں کے رد میں ارشاد ہوا ہے جو نزول قرآن کے بارے میں کہتے تھے کہ "مَا أَنْزَلَ اللّٰهُ عَلَى بَشَرٍ مِنْ شَيْءٍ۔ یعنی اللہ نے کسی بشر پر کوئی چیز نہیں اتاری ہے۔" اس پر اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ اگر یہ حقیقت ہے کہ اللہ بشر پر اپنا کلام نہیں اتارا کرتا تو پھر بتاؤ "وہ کتاب جو موسیٰ لے کر تمہارے پاس آئے تھے کس نے اتاری تھی؟ (مَنْ أَنْزَلَ الْكِتَابَ الَّذِي جَاءَ بِهِ مُوسَىٰ)۔ پھر خود ہی فرمایا ہے کہ "اے پیغمبر کہہ دو" اللہ نے"۔ یعنی کتاب موسیٰ کو اللہ ہی نے نازل کیا تھا۔

اسم ضمیر یعنی "یاہو" کو ذکر مشروع قرار دینے کے لیے ان لوگوں نے آیت وَمَا يَعْلَمُ تَأْوِيلَهُ إِلَّا اللّٰهُ کو اپنی تاویلات فاسدہ کا تختۂ مشق بنایا ہے۔ ان کے نزدیک اس آیت کا مطلب یہ ہے کہ "ھُو" کی تاویل خدا اور راسخین فی العلم کے سوا اور کوئی نہیں جانتا۔" لیکن ظاہر ہے کہ کلام الٰہی کے ساتھ اس سے بڑھ کر ظلم اور کیا ہو سکتا ہے جو یہاں اختیار کیا گیا ہے۔

الغرض لفظ مفرد کے ذریعہ، خواہ وہ ظاہر ہو یا مضمر، خدا کا ذکر نہ تو سلف صالحین سے منقول ہے نہ پیغمبر نے اس کو مشروع قرار دیا ہے۔ کیونکہ ایک لفظ جملہ نہیں ہو سکتا جس کا کوئی مفید یقین مفہوم ہو۔ اس لیے اس کو ایمان یا کفر کا مدار نہیں قرار دیا جا سکتا۔ ایک لفظ صرف تصور مطلق پیدا کر سکتا ہے جس پر نفی یا اثبات کا حکم نہیں لگایا جا سکتا الا آنکہ قلب میں پہلے سے کوئی ایسی معرفت اور حالت موجود ہو جو اس لفظ سے مل کر ایک متعین مفہوم پیدا کر دے، ورنہ عام حالات میں لفظ مفرد قلب کو ایک مجرد تصور کے سوا کوئی مفید یقین مفہوم نہیں بخشتا۔ اور شریعت نے جتنے اذکار تعلیم فرمائے ہیں وہ سب کے سب ایسے ہی ہیں جو بذات خود، نہ کہ کسی غیر شے کی مدد سے، مفید یقین معرفت پیدا کرنے والے ہیں۔ اس نے کہیں اس قسم کے ذکر کی دو دھاری تلوار چلانے کی قطعی اجازت نہیں دی ہے، چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ جن لوگوں نے یہ خطرناک کھیل کھیلا انھوں نے اس تلوار سے خود اپنی گردنیں آپ کاٹ لیں اور توحید و معرفت الٰہی کے مقام رفیع پر پہنچنے کی بجائے طرح طرح کے الحاد اور عقیدہ مذ...

اتحاد کے قعرِ ضلالت میں جا گرے۔ خصوصاً اسمِ مضمر یعنی "یا ہو یا ہو" کا ذکر تو خوفناک فتنوں کا سرچشمہ ہے۔ اس طریقۂ ذکر کو طریقۂ نبوی سے کوئی دور کا علاقہ بھی نہیں بلکہ سرتاپا بدعت اور ضلالت ہے۔ کیونکہ جو شخص "یا ہو یا ہو" کی رٹ لگاتا رہتا ہے اور ذاتِ باری کا اصل نام نہیں لیتا اس کے اس مبہم قول میں "ہو" کی ضمیر کا مرجع صرف وہی چیز ہو سکتی ہے جو اس کے قلب میں پہلے سے متصور ہو۔ اور یہ ایک بدیہی امر ہے کہ ہر قلب کا ہر حال میں، ذاتِ الٰہی کا صحیح تصور رکھنا اور نورِ حق سے معمور ہونا ضروری نہیں۔ وہ کبھی گمراہ ہوتا ہے، کبھی ہدایت یاب، کبھی معبود اور معبودیت کا صحیح تصور رکھتا ہے اور کبھی غلط۔ اس لیے "یا ہو" بکتے رہنے کے معنی لازمی طور پر اللہ واحد ہی کو پکارنے کے نہیں ہو سکتے، بلکہ اس امر کا بھی امکان ہے کہ جس ذات کو وہ پکار رہا ہے اس کا تصور اس کے ذہن میں اس تصور سے بالکل جداگانہ ہو جو اللہ وحدہٗ لاشریک کا ہے۔

پس یہ طریقۂ ذکر گوناگوں دشمنِ ایمان خطرات سے پرہے اور کوئی ایک لفظ تن تنہا، دین میں کوئی اعتبار نہیں رکھتا اور جمہور اہلِ اسلام کا اس بات پر اتفاق ہے کہ فقط ایک لفظ "اللہ" کہہ دینے پر ایمان کا حکم نہیں لگایا جا سکتا یہی وجہ ہے کہ شریعت بیضا نے کسی کو لفظ مفرد کے ذریعہ ذکر کرنے کی اجازت نہیں دی ہے۔

یہاں قرآن مجید کی ان آیات سے دھوکا نہ کھانا چاہیے جن میں "ذکر اسم رب" اور "تسبیح اسم رب" کے الفاظ آتے ہیں۔ ان آیات میں "ذکر اسم" سے مراد یہ ہرگز نہیں ہے کہ صرف "اللہ" کا لفظ دہراتے رہو بلکہ خود قرآن کے مبلغ اور شارح نے اس "ذکر" کے مفہوم اور طریقہ کی توضیح فرما کر ہمیں بتا دیا ہے کہ ان جملوں کا ورد کرو جو اللہ تعالیٰ کے ذکر اور اس کی تسبیح پر مشتمل ہوں۔ مثلاً جب آیت فَسَبِّحْ بِاسْمِ رَبِّكَ الْعَظِيمِ نازل ہوئی تو رسول اللہ صلعم نے فرمایا کہ "اس حکم پر رکوع میں عمل کرو"، اور جب آیت "سَبِّحِ اسْمَ رَبِّكَ الْأَعْلَى" نازل ہوئی تو فرمایا کہ "اس حکم پر سجدہ میں عمل کرو"۔ اور پھر ان احکام پر عمل کرنے کا طریقہ یہ بتایا کہ رکوع میں "سبحان ربی العظیم" اور سجدہ میں "سبحان ربی الاعلیٰ" کہا جائے۔ معلوم ہوا کہ اسمِ رب کی تسبیح سے مراد ایسے جملوں کا ورد ہے جو اللہ تعالیٰ کی حمد اور پاکی کا مفہوم رکھتے ہوں نہ کہ فقط ایک لفظ "اللہ"۔ چنانچہ مسلمانوں کے لیے نمازوں، اذانوں، عیدوں اور حج کے مراسم میں جو اذکار مقرر اور مشروع کیے گئے ہیں وہ سب کے سب جملہائے تامہ ہیں نہ کہ الفاظ مفردہ۔ الفاظِ مفردہ کا ذکر، خواہ وہ ظاہر ہوں یا مضمر، سرے سے شریعت میں کوئی بنیاد ہی نہیں رکھتا چہ جائے کہ اس کو خواص اولیاء اور عارفین کاملین کا ذکر خصوصی کہا جائے۔ یہ تو طرح طرح کی بدعتوں اور گمراہیوں کا سرچشمہ ہے۔

سلامتیٔ دین کی راہ جیسا کہ ہم پہلے بیان کر چکے ہیں، دین کی بنیاد دو چیزوں پر ہے، ایک تو یہ کہ اللہ ہی کی بندگی کی جائے، دوسری یہ کہ اللہ کی بندگی اور عبادت اس طریقہ پر کی جائے جو مشروع ہو، نہ کہ بدعی طریقوں سے۔ یہی حقیقت ہے جو آیت ذیل میں واضح کی گئی ہے:۔

فَمَنْ كَانَ يَرْجُو لِقَاءَ رَبِّهِ فَلْيَعْمَلْ عَمَلًا صَالِحًا وَلَا يُشْرِكْ بِعِبَادَةِ رَبِّهِ أَحَدًا۔

سو جو کوئی اپنے پروردگار سے ملنے کا اندیشہ رکھتا ہو اس کو چاہیے کہ اچھے کام کرے اور اپنے رب کی بندگی میں کسی کو شریک نہ کرے۔

اور پھر یہی وہ جامع معنی ہے جو شہادتین سے ظاہر و باطن میں جلوہ گر ہے۔ کلمہ اول لا الٰہ الا اللہ میں اس بات کا اقرار ہے کہ ہم خدا کے سوا کسی کی عبادت نہیں کرتے اور کلمہ ثانیہ یعنی محمد رسول اللہ میں اس امر کی شہادت ہے کہ محمد ہی وہ پیامبر ہیں جنھوں نے معبود کے احکام ہم تک پہنچائے ہیں، اس وجہ سے ہمارے لیے یہ ضروری ہے کہ ان کے ارشادات کی تصدیق اور ان کے احکام کی اطاعت کریں۔ خدا کے اس پیامبر نے اپنے فرائض نبوت کو ادا کرتے ہوئے ان تمام باتوں اور طریقوں کی، روز روشن کی طرح وضاحت کر دی ہے جن کے ذریعہ ایک بندہ کو اپنے معبود کی عبادت کرنی چاہیے اور ان تمام طرق عبادت سے روک دیا ہے جو من گھڑت ہوں اور جن کی اصل کتاب و سنت میں نہ ملتی ہو۔ بنابریں جس طرح ہم اس امر کے مکلف ہیں کہ صرف اللہ ہی سے ڈریں، اسی پر ہر معاملہ میں بھروسہ رکھیں، اسی سے مدد مانگیں اسی کو پکاریں، اسی کو اپنی رغبتوں کا مرکز بنائیں اور صرف اسی کی بندگی کریں، اسی طرح ہمیں یہ حکم بھی دیا گیا ہے کہ رسول کا اتباع کریں، اس کے احکام کی بلاچون و چرا پابندی کریں اور اس کے نقوش قدم کو اپنا ہادی و رہبر بنائیں، حلال اسے جانیں جس کو اس نے حلال گردانا ہو اور حرام اسے سمجھیں جس کو اس نے حرام ٹھیرایا ہو اور دین صرف اس چیز کو مانیں جس کا اس کے قول و فعل میں نشان ملتا ہو۔

پورا قرآن انہی حقائق اور مبادیِ دین کی تشریحات سے بھرا ہوا ہے، اس کے جس ورق کو دیکھو عبادت اور عبودیت کا یہی مفہوم بے نقاب نظر آئے گا۔ عبادت، انابت، خشیت، استعانت، توکل، خوف اور تقویٰ کا جہاں بھی ذکر ہوگا ہر ایک کی نسبت اللہ جل مجدہٗ کی طرف ہوگی، صرف دو چیزیں ایسی ہیں جن میں اللہ کے ساتھ اس کے رسول بھی شریک ہیں، ایک تو اطاعت، دوسری محبت۔ یعنی اطاعت اور محبت جس طرح خدا کی کرنی چاہیے، اسی طرح ـــــ اس کی تبعیت میں ـــــ رسول کی بھی کرنی چاہیے۔ باقی چیزوں میں رسول کسی معنی میں بھی اللہ کے شریک نہیں بلکہ عام انسانوں کی طرح خود وہ بھی اس پر مامور ہیں کہ اللہ واحد ہی کی عبادت کریں، اسی پر بھروسہ رکھیں، اسی سے طلب اعانت کریں اور اسی کے حضور اپنی التجائیں پیش کریں۔ شیطان نے نصاریٰ وغیرہ کو اسی معاملہ میں گمراہ کیا اور وہ اپنے انبیاء اور اولیاء کو ان کے صحیح موقف پر نہ رکھ سکے، بلکہ اللہ وحدہٗ لاشریک لہٗ کی مخصوص صفات میں انھیں بھی شریک کر دیا۔ انھیں سے دعائیں اور التجائیں کرنے لگے اور انھیں پر توکل کرنے لگے۔ لیکن مومنین مخلصین کو اللہ تعالیٰ نے ہدایت بخشی اور وہ صراط مستقیم پر چل کر مغضوبوں اور گمراہوں کے ملعون گروہوں میں شامل ہونے سے محفوظ رہے۔ انھوں نے دین کو اللہ ہی کے لیے خالص کیا، اپنی پیشانیاں اسی کے آستانہ پر جھکائیں، اسی کو مصیبتوں میں پکارا، اسی سے اپنی امیدیں وابستہ کیں، اسی کی بارگاہ میں عاجزانہ جھکے، اپنے معاملات کو اسی کے حوالے کر دیا اور ہر قدم پر اسی پر کامل بھروسہ رکھا۔ پھر اس کے رسولوں کی اطاعت کی، ان سے محبت کی، ان کی تعظیم و تکریم کی، ان سے دوستی اور موالات کا رشتہ استوار کیا، کٹھن گھڑیوں میں ان کے لیے جان کی بازی لگا دی، اپنے اعمال میں ان کی ہدایتوں پر کاربند رہے اور ان کے روشن کیے ہوئے چراغ سے زندگی کی منزلیں طے کیں۔

یہی وہ دین اسلام ہے جس کی تبلیغ و اشاعت کے لیے تمام انبیاء آتے رہے اور جس کے سوا اللہ کے دربار میں کوئی اور دین مقبول نہیں۔ اور یہی ہے عبادت کی حقیقت۔ اللہ تعالیٰ ہر مومن کو اس حقیقت کی کامل معرفت عطا فرمائے اور اس کے مقتضیات کے مطابق اپنی اپنی زندگیاں ڈھالنے کا عزم اور استقلال مرحمت کرے۔